جلد ۹۶ دسمبر ۱۹۸۱ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۶ | دسمبر ۱۹۸۱ء مطابق صفر ۱۴۰۲ھ | عدد ۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۰۳۱۶

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروقی ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ماہ محرم الحرام کا عشرۂ گریہ و ماتم گذر گیا!

آؤ، اب سوچیں کہ معاملہ کیا تھا؟ تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤ کہ تم شیعہ ہو کہ سنّی، صرف مسلم کی حیثیت سے غور کرو۔ بہت سے واقعات دردانگیز بھی ہوتے ہیں، لیکن اگر ان میں دینی اور انسانی اہمیت ہو تو وہ تفکر بھی چاہتے ہیں۔ جذبات کا ریلا اگر تند و تیز ہو تو سوچنے کی قوتیں پوری طرح کام نہیں کرتیں، اور سوچنے میں کمی رہ جائے تو کتنے ہی امورِ مہمہ میں رسمیت زور پکڑ لیتی ہے اور معنویت گم ہو جاتی ہے۔ بڑے واقعات صرف ماضی کی حکایات نہیں ہوتے، بلکہ وہ حال کے لیے بھی سبق ہوتے ہیں۔ پس غمِ حسینؓ آنکھوں سے ٹپک جانے ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ تو رگ و پے میں سرایت کر جانے اور کرداروں کی رُوح بن جانے کے لیے ہے۔

امام حسینؓ کی عظمت یہ ہے کہ وہ اپنے کسی مفاد کے لیے نہیں بلکہ صلاحِ اُمّت اور فلاحِ انسانیت کے لیے زندگی کی ساری دلچسپیاں چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے اور پھر جب اعلائے کلمۃ الحق کی راہ پر چل کھڑے ہوئے تو اپنی جان کے ساتھ اپنے قبیلے اور اپنے رفیقوں کو قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ ایک راستہ یہ تھا کہ وہ اپنے دَور کے اس حوصلہ شکن منظر کو دیکھ کر ماتم کے لیے بیٹھ جاتے کہ عجمی بادشاہت نے دینِ حق کے نظامِ خلافت کو منہدم کر کے اپنا تخت بچھا لیا ہے یا وہ رندانہ ثقافت کے غلبے کے دکھ میں آنسو بہاتے رہتے۔ امام کا مقام اس لیے بلند ہوا کہ عزم و ہمت کی راہ پہ گامزن ہوئے اور اس قوت کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کا مجاہدانہ کارنامہ انجام دیا۔ جو شورائی نظام کے بجائے فردِ واحد کی حکمرانی، موروثی طرزِ حکومت، کتاب و سنت سے آزاد فرماں روائی، دولت و سطوت کے مظاہرے

عیش و طرب کے ہنگامے اور فنونِ رندانہ کی سرگرمیاں ساتھ لے کے آئی تھی۔ امام کا مسلک شیون و ماتم کے بجائے سلطانِ جائر کے سامنے شاہدِ حق بن کے کھڑے ہونے کا تھا جس کا مرحلۂ تکمیل شہادت ہے۔

امام کی مظلومانہ شہادت پر جس قدر غم ہوتا ہے اس سے بڑھ کر فخر محسوس ہوتا ہے کہ ملّت اسلامیہ کی اِس پُرنور شخصیت نے تاریخ میں ایک عظیم مثال قائم کی۔ بلکہ ساری انسانیت کے لیے روشنی کا مینار کھڑا کر دیا۔

اُمت کا ہر فردِ حق کا نقیب اور شاہد علی الناس ہے جو دعوتِ دین سے کام کا آغاز کرتا ہے، شہادتِ حق دیتے ہوئے عمر گزارتا ہے، قدم قدم پر کشمکش و جہاد کے مراحل سے گذرتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات وہ شہادت کے اس تکمیلی مقام کو بھی پا لیتا ہے، جسے تسلیمِ جاں کہتے ہیں۔ ہماری تاریخ شہدا کی تاریخ ہے، دعوتِ حق اور شہادتِ حق کی تاریخ ہے اور حق کی خاطر جانوں کی نذر اللہ کے سامنے پیش کرنے والوں کی تاریخ ہے۔ یہ تو سارا گھرانا ہی اہلِ شہادت کا گھرانہ ہے۔

ع کسے کہ کُشتہ نہ شُد از قبیلۂ ما نیست

جب شہادت کی داستان چھڑتی ہے تو پہلے تو امام حسینؓ کے ساتھ ساتھ مجھے سیدنا عمرؓ کی یاد بھی آتی ہے۔ (جن کی شہادت سے ماہِ محرم کا آغاز ہوتا ہے) ۔ پھر سیدنا عثمانؓ کی مظلومی کی تصویر بھی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ پھر سیدنا علیؓ کے بہتے ہوئے آخری قطرہ ہائے خون بھی نگاہوں میں جھلملاتے ہیں۔ پھر تاریخ میری انگلی تھام کر حضرت سمیّہ کی میّت کے سامنے لے جاتی ہے۔ کبھی وہ سیّد حمزہؓ اور جعفر طیّارؓ کی شانِ قربانی دکھاتی ہے۔ کبھی وہ مجھے مصعبؓ بن عمیر جیسے مکہ کے بانکے نوجوان کی لاش دکھاتی ہے جسے ڈھانپنے کے لیے پورا کپڑا موجود نہیں تھا چنانچہ پیروں کی طرف گھاس ڈالی جاتی ہے۔ میرے حافظے کی نگاہوں کے سامنے ذو البجادینؓ کو رات کی تاریکی میں لحد میں اُتارا جا رہا ہے۔ میں مدینے کے ستّر معلّمین و قاریان کے تعلیمی قافلے کو مخالف سازشیوں کی چالبازی کا شکار ہوتے دیکھتا ہوں۔ پھر وہ سولی گویا میرے دماغ میں نصب ہے جس پر حضرت خُبَیبؓ کو مکہ والوں نے لٹکایا تھا اور دوسری

طرف زید بن دثنہؓ کو تنعیم میں آخری سانسیں لیتا دیکھتا ہوں۔ اُدھر ایرانی گورنر فروہ کو اسلام قبول کرنے کے جرم میں حکومت پھانسی دیتی ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ بن حنبل پر برسنے والے کوڑوں کی سزا آج بھی گوشِ دل سے سُنائی دیتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابن تیمیہؒ پابندیٔ حق کی وجہ سے بندی خانوں کی صعوبتیں بھگتتے ہیں۔

یہ سلسلہ چھڑا تو میری نگاہ اپنے قریب کی تاریخ پر بھی جاتی ہے۔ آخر میں سید احمدؒ شہید، شاہ اسمٰعیلؒ شہید، تحریک مجاہدین کے ہزاروں شہدائے معرکہ آرا اور شہدائے سزا یافتگان کو کیسے بھول جاؤں؟ بے شمار فلسطینیوں کے خون کی سُرخی کیسے آنکھوں سے اُوجھل ہو جاتی؟ عدنان مندریس کی سزائے موت کو کیسے فراموش کر دیا جاتے؟ امام حسن البنا اور سید قطب شہید اور اُن کے ساتھیوں کی جان سپاریوں کو حساب سے کیسے خارج کر دیا جاتے؟ وسط ایشیا کے وہ مسلمان جو اشتراکی بہیرہ دستیوں کا شکار ہوتے، وہ جنہوں نے ایرانی بادشاہت کے خلاف قربانیاں دیں، اور وہ جو آج افغانستان میں اشتراکی سامراج کے تسلط سے بچنے کے لیے خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر ختم ہو رہے۔ پھر وہ جو اریٹیریا میں، یوگنڈا میں، جنوبی فلپائن میں مسلمان ہونے کی قیمت کے طور پر اپنا لہو اور اپنی ہڈیاں دے رہے ہیں، مزید وہ بے بس مسلمان جو کمبوچیا، ویت نام، تھائی لینڈ اور برما کے علاوہ خود بھارت میں مسلسل زندگیوں کا خراج پیش کر رہے ہیں، کیا محفلِ شہادت میں ان لاکھوں افراد کا کوئی مقام نہیں۔

یہ سب امام حسینؓ کے ساتھی ہیں۔ مختلف شہیدوں کی کربلائیں الگ الگ ہیں، اُن کے کوفے جُدا جُدا ہیں، اُن کے شمر مختلف ہیں، مگر یہ سب کے سب ایک ہی شمعِ ایمان پر جل مرنے والے پروانے ہیں۔ حسینؓ اِن سب کے ہیں، اور یہ سب حسینؓ کے ہیں۔

ہم جو زندہ ہیں، ہمیں بھی جاننا چاہیے کہ جدید تہذیب کی بنائی ہوئی کربلا میں کھڑے ہیں۔ مادیت پرستانہ دہشت کا بڑا ہولناک صحرا ہمارے گرد پھیلا ہوا ہے۔ اس صحرا میں نت نئے انقلابی حادثوں کے جھلسا دینے والے بگولے اُٹھتے ہیں۔ اس میں محرومیوں کے کانٹے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس میں جو دریائے

فرات بہتا ہے۔ اس کا پانی پینے سے پیاس اور بھڑکتی ہے۔ اور اس صحرا میں مادیت کے لشکروں میں گھرے ہوئے ہر شخص کی خودی اور شخصیت آہستہ آہستہ ذبح ہوتی رہتی ہے۔

خود مسلمانوں کی دنیا میں دیکھو تو کہیں موروثی بادشاہت کا جبر ہے اور کہیں آمرانہ تسلط کا جور، کہیں اسلامی حکومتیں ہیں مگر خدا اور رسولؐ کے عطا کردہ حقوق کی غصب اور قوانین شریعت کے تقاضوں سے بے نیاز۔ کہیں کوئی اچھا حکمران آ بھی جائے تو انتظامی مشینری کے کارپرداز سیکولر اور اشتراکی ذہن کے ہیں۔ اور احکام نافذ کرنے والے عمّال فرعونی مزاج کے۔ کہیں محنت زیادہ اور حاصل کم — کہیں ایک طرف عیش و تنعم اور دوسری طرف فقر و فاقہ — کہیں کلچر کے نام پر یہی میخانہ ہائے طرب اور رقص خانہ ہائے شبانہ۔

مگر ہماری شانِ خودمستی یہ ہے کہ ہماری ساری دلچسپیاں آمدنیاں بڑھانے کے لیے وقف ہیں۔ دولت اب ایک ضرورت سے آگے نکل کر باقاعدہ محبت بن گئی ہے۔ ہم سارے اعلیٰ مقاصد کو بھول بھال کر معیارِ زندگی کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ دوسروں کے حقوق کو نظر انداز کر کے نوکریاں اور کاروبار کرتے ہیں۔ ہوٹلوں میں سکون حاصل کرتے ہیں، ریڈیو سے معلومات لیتے ہیں۔ ٹیلی وژن سے تفریح حاصل کرتے ہیں۔ وی سی آر حاصل کر کے بلیو فلموں تک کا مزہ لیتے ہیں۔ سردیوں میں گرم کمروں میں اور گرمیوں میں سرد کار مشینوں کے سایے میں ہم نہ جانے کس جہاد میں مشغول ہیں اور کونسا انقلاب لانا ہمارے مدنظر ہے؟ معلوم نہیں، کس کربلا کا رخ ہے؟ کونسی قوت کو چیلنج کرنے کے عزائم ہیں؟

ہم جو مسلمان ہیں — سنی ہوں یا شیعہ — کبھی ہم نے یہ بھی سوچا ہے کہ مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں؟ کبھی یہ سوچا کہ ہم دوسروں کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں کرتے ہیں؟ کبھی سوچا کہ ہم کماتے کس طرح ہیں؟ اور خرچ کس طرح کرتے ہیں؟ کبھی یہ سوچا کہ ہمارے مشاغل کیا ہیں؟ کبھی حساب لگایا کہ ہمارے معاشرے میں خیانت کاری کتنی ہے؟ کبھی اندازہ کیا کہ حرام خوری کا تناسب کتنا ہے؟ وہ ہمارے ہی بھائی ہیں جن سے ملک کے جیل بھرے پڑے ہیں۔ وہ ہمارے ہی ساتھی ہیں جو قتل کر کے پھانسی لگتے ہیں اور عمر قیدیں بھگتتے ہیں۔ اور بہت سے قانون کی گرفت سے بچ بھی نکلتے

ہیں۔ وہ ہمارے ہی ماحول کے پروردہ ہیں جو چوری اور عیب تراشی کرتے ہیں۔ ہمارے ہی قومی قافلے کے ہمسفر ہیں جو زنا، جوئے، اسمگلنگ اور سود سے ملوث ہیں۔ وہ ہمارے ہی ہم دم، ہم قوم ہیں، جو نمازوں کے تارک، روزہ خور اور زکوٰۃ چور ہیں۔ ہمارے ہاں وہ ادب پیدا ہوتا ہے جس میں خدا اور مذہب کا مذاق اُڑا کر لطافت پیدا کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ایسی فلمیں، ٹیلی وژن پروگرام، اخبارات کے صفحات اور اشتہارات کے ڈیزائن تیار ہوتے ہیں، جن میں نسائیت کے غمزہ و ادا کو سامانِ کاروبار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہمارا مجموعی کردار اس مقصد کے اُلٹ نشوونما پا رہا ہے جس کے لیے شہیدِ کربلا نے قربانی دی تھی۔

آخر جس مسلمان کو یہی معلوم نہ ہو کہ مسلمان کیا ہوتا ہے؟ وہ حسین کو کیا سمجھے گا اور شہادتِ حسین سے کیا سبق لے گا۔

مَیں جب اپنا یہ اجتماعی حال زار دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ کبھی ہمیں اپنی پستیوں کے ماتم کا بھی جلوس نکالنا چاہیے اور اپنی خود شناسی کے دکھ پر بھی مجالسِ عزا منعقد کرنی چاہئیں۔ مگر پھر فوراً ہی مجھے میرا ایمان و شعور اس خیال سے روک دیتا ہے۔ معاشروں کی اصلاح ماتموں سے نہیں ہوتی، قوموں کی تعمیر عزاداریوں سے نہیں ہوتی۔ بدی کی قوتوں کو آنسوؤں سے شکست نہیں دی جاسکتی۔ اس کام کے لیے تو ویسا ہی عزم، ویسا ہی جذبۂ اقدام، ویسا ہی ولولۂ قولِ حق اور ویسا ہی ذوقِ شہادت درکار ہے جس کا مظاہرہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے کیا۔

اُمتِ مصطفوی کا بھلا تو صرف اس میں ہے کہ علیؓ و حسینؓ سے سبق لینے والے بھی اور ابوبکرؓ و عمرؓ سے مثال لینے والے بھی شہداء علی الناس بن کے اُٹھیں، صداقت و دیانت کو عام کریں، رزقِ حرام کا ایک ذرہ قبول کرنے پر فاقہ کو ترجیح دیں۔ اور اسلامی معاشرے میں عجمی بادشاہت و جبریت کے ساتھ ملحدانہ مادّیت کی افادہ پرستی اور اس کے پیدا کردہ کلچر کی بادہ ارزانیوں اور رقاصاؤں کی عریانیوں کو اسی طرح مسترد کریں جیسے حضرت امام حسینؓ نے ان کو مسترد کیا تھا۔ اور خانوادۂ حسینؓ کی عفت مآب بیبیوں نے اُسے نگاہِ حقارت کا مستحق سمجھا تھا۔

کوئی عالم ہو یا عامی ــــ سنی ہو یا شیعہ ــــ ایک فرقے سے منسوب ہو یا دوسرے سے موسوم ۔ دین کی ماہیت وحقیقت سب کے لیے ایک ہے۔ دین کی اساسی دعوت پر جمع ہو کر سب کو شہداء للہ بن کے اٹھنا چاہیے ۔ سب کو شہداء علی الناس ہونا چاہیے ۔ ہر برائی، ہر خرابی، ہر فتنہ، ہر ظلم، ہر استحصال کے خلاف ــــ خواہ وہ اوپر سے آئے یا نیچے سے ابھرے ــــ اگر حساس مسلمان مل کر کام کریں تو ہمارا معاشرہ بے شمار گندگیوں سے پاک ہو سکتا ہے، جنھوں نے زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔ ہم لوگ اگر اپنا فرض ادا کریں تو کوئی بعید نہیں کہ اپنے اردگرد کی تپتی کربلا سے کامیاب ہو کر نکل جائیں۔

کوئی ایسا محرم بھی آنا چاہیے کہ امام شہید سے محبت رکھنے والا ہر فرد اپنی زندگی بدل کر امام کے اسلامی مشن کے لیے سرگرم عمل ہونے کا عہد کرے ۔ پھر ہر آنسو کی قدر وقیمت ہے جو پلکوں پہ جھلملانے لگتا ہے، اور اس سے بڑھ کر قیمت اس صبر کی ہے، جو درد کو آنکھ سے ٹپکنے نہیں دیتا بلکہ انسانی کردار کے رگ و پے میں جاری وساری کر دیتا ہے۔

---

(۲)

اللہ نے ہمیں اقبال کیا دیا، بہت بڑی قوت عطا کر دی، ایسی قوت جو ہمارے ذہن و کردار کو تا دیر متحرک رکھے گی۔

ابھی ابھی یومِ اقبال گذرا ہے، فضا میں اس کی لمعانیاں باقی ہیں۔ جگہ جگہ چھوٹی بڑی مجالس میں اقبال کے کام اور مقام کے متعلق مضامین پڑھے گئے۔ بعض چیزیں رسائل و اخبارات میں چھپ رہی ہیں۔

پاکستان کے وجود کا تعلق دو حوالوں سے اقبال سے منسلک ہے۔ ایک اس حوالے سے کہ برصغیر میں اقبال نے ایک جداگانہ مسلم مملکت کے لیے پیغام دیا تھا۔ دوسرے اس حوالے سے کہ اقبال نے پاکستان میں عالمِ قرآنی یا نظامِ اسلامی کے قیام کا جذبہ ہمیں ودیعت کیا۔ اور آج جو تحریک احیائے اسلام ۴۳ برس سے یہاں نشوونما پا رہی ہے اس کے لیے جہاں ایک مضبوط تاریخی پس منظر موجود تھا، وہاں اقبال نے اس کے لیے فکر و احساس کی فضا تیار کی۔

اقبال کی شاعری جذباتی اور خواہشاتی انداز کی شاعری نہیں ہے۔ وہ اگر تلذذ کے راستے پر بڑھتا تو

کبھی ایک بڑا شاعر نہ ہوتا ___ جسم کے گرد طواف کرنے والا کوئی جنسیت زدہ شاعر، یا رندانہ اور لاأبالیانہ سطح سے آگے نہ جا سکنے والا ادیب، یا محض ذاتی جذبات و احساسات اور بکھرے ہوئے افکار کا قیدی فن کار کوئی اونچا مقام نہیں پا سکتا۔ اقبال کی خصوصیات یہ ہیں کہ:-

۱___ وہ یقین کا شاعر ہے۔ یعنی حیات و کائنات اور خدا و انسان کے متعلق اُس کے ہاں ایک مضبوط فکر پائی جاتی ہے۔ یہ فکر شروع ہی سے موجود تھی، مگر پہلے دھندلی تھی، پھر واضح ہوتی گئی۔ اُس نے منفی طرزِ فکر سے آغاز ہی نہیں کیا۔ البتہ اُس کا مثبت طرزِ فکر مسلسل نکھرتا گیا، مضبوط ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ کیفیت پیدا ہو گئی جسے ایمان کہتے ہیں۔

۲___ وہ کشمکش کا شاعر ہے۔ اُس کی کشمکش وقت کے جامد مذہبی و معاشرتی ماحول کے خلاف بھی تھی، انگریزی غلامی کے خلاف بھی، ہندو اکثریت کے بڑھتے ہوئے سیاسی و اقتصادی تسلّط کے خلاف بھی ___ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مغرب کی لادین مادہ پرستانہ تہذیب کے خلاف بھی ___ یہ عجیب واقعہ ہے کہ جس قومی پسپائی کا آغاز میسور اور پلاسی میں جنگی شکست سے ہوا تھا اور جس کی تکمیل تحریک مجاہدین اور انقلاب ۱۸۵۷ء کی بظاہر ناکامی سے ہوئی، اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے برطانوی اقتدار اور مغربی علوم و افکار اور مادہ پرستانہ تہذیب و معاشرت کے سامنے خم کھا جانے کی پالیسی اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ جب سرکاری تعلیم اور نوکریوں اور ممبریوں کی دوڑ میں اقبال کی قوم، خصوصاً اس کے پیش رو طبقے شرحِ صدر کے ساتھ شریک ہو گئے تو اقبال نے اپنا نغمہ الاپا جو پہلے بانگ درا تھا، آگے چل کر بالکل ضربِ کلیم ہی بن گیا۔ یہاں پہنچ کر تو اقبال اپنے آپ کو میدانِ جنگ میں پاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ سے نوائے چنگ طلب نہ کرو۔

مادہ پرستانہ تہذیب کے پورے نظامِ افکار کو وہ اپنے جہانِ شعر میں چھان پھٹک کر دکھاتا ہے۔ اور سرمایہ دارانہ جمہوریت اور آمریت و فسطائیت اور کمیونزم و سوشلزم سب کو شعور کی کسوٹی پر کھوٹا دکھا دیتا ہے۔ وہ اس تہذیب کی فکری و سیاسی شخصیتوں اور کرداروں کی جانچ کرتا ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ غلامستانِ برصغیر میں پرورش یافتہ اور دیارِ مغرب کے مراکزِ علم سے جام بھرنے والا یہ نوجوان کہاں سے اپنے لیے وہ شخصیت لایا کہ جس نے اُسے مغرب زدگی اور فرنگ پرستی کے سیلِ ہلاکت کے سامنے اسلامی حکمت کے موقف پر استوار کر دیا۔

ماحول اور خصوصاً اغیار کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر کرشمہ ہائے فن دکھانے والوں کے قد بڑے نہیں ہو سکتے۔ بلند بامی صرف اُس کو نصیب ہوتی ہے جو ماحول کی پستیوں اور اغیار کی خودی کُش بلندیوں' دونوں کے خلاف معرکہ آرا ہوتے ہیں۔

۳ ـــ اقبال وقت کے ناخوشگوار سیاسی احوال کے مقابلے میں اپنا اصل زورِ فکر و نوا مغرب کی عالمگیر تہذیب دوں نہاد کے خلاف صرف کرتا ہے۔ کیونکہ سیاسی احوال تو بدلتے رہتے ہیں، البتہ ایک تہذیب اپنے ساتھ جو فکری سیلاب لا رہی تھی وہ آسانی سے رکنے والا نہ تھا اور اُس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایمان و شعور کی قوتوں کی ضرورت تھی۔ اقبال نے اپنے نوجوانوں میں ان قوتوں کو اُبھارنے کی کوشش کی۔

۴ ـــ اُس نے صرف منفی ردِّ عمل کا شاعر بننا پسند نہیں کیا، بلکہ لادین تہذیب کے مقابلے پر اُس نے اسلامی تہذیب کے عناصر و مظاہر اور اُس کی اعتقادی و فکری رُوح کو اپنے فن سے اُبھارنے کے لیے کاوشیں کیں۔ یہی مثبت انداز اقبال کی عظمت کا باعث بنا۔ اگر وہ محض گریہ و ماتم کی راہ اختیار کرتا تو تان مایوسی پہ ٹوٹتی۔ منفیت کے بل پر کوئی مؤثر تحریک بپا نہیں ہوتی۔ حزن و یاس کے جذبات کبھی سرمایۂ انقلاب نہیں بن سکے۔

۵ ـــ اسلامی تہذیب کا راگ شاعری کے ساز پر الاپنے کے لیے اُسے بنا بنایا اسلوب نہیں ملا، چند متفرق جزوی تجربے تھے، مگر خدا پرستانہ تہذیب کو پیش کرنے اور اس انقلابی حرکت کا ذریعہ بنانے کے لیے اقبال نے اپنا اسلوب خود ایجاد کیا اور بہت سا وقت صرف کر کے اُسے نشوونما دی۔ بات یہاں تک پہنچی کہ وہی دینی حقائق جن کا مذاق اُڑا کر ادب و شعر کی رونق کا سامان کیا جاتا تھا، اچھی خاصی صراحت سے اقبال نے بیان کیے، مگر نہ فن مجروح ہوا، نہ شعریت میں کوئی کمی آئی۔ بلکہ خواص و عوام، علماء و صوفیا اور جدید تعلیم یافتہ طبقوں کے ہر حلقے کے لیے اقبال کے کلام میں کشش بڑھتی گئی۔

ان وجوہ سے اقبال اُس بلندی پر پہنچا کہ آج اقبال کی شاعری کے دورِ آغاز کو اسّی سال اور اُس کی وفات کو ساڑھے تینتالیس سال گذر چکے ہیں، مگر اب تک کوئی شاعر سر اُبھار نہیں سکا۔ بلکہ بعض خاصے اچھے درجے کے معروف شاعر دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنوں کے نہاں خانوں کی محفلوں سے بھی ایسے اُٹھے کہ آج دماغ پر زور دیے بغیر اُن کی یاد تک نہیں آتی۔ ادھر کئی زندہ

اور بظاہر مجاری بھر کم شاعر ایسے ہیں جو طبقاتی اور سماجی لحاظ سے بہت اہل رسوخ ہیں اور بڑے بڑے حاشیہ برداروں کی فوج اُن کے ناموں کے کتبے اُٹھائے پھرتی ہے، مگر کسی طرح بات نہیں بنتی۔

اس مرتبے کے اقبال کے کیے ہوئے کام نے حالات پر ایک اثر یہ ڈالا کہ پاکستان کی تشکیل کا راستہ بنا، اور دوسرا اثر اس کا یہ نمایاں ہے کہ اِس وقت پاکستان میں (اور پاکستان سے باہر بھی) احیائے اسلام کی تحریکیں نمودار ہو کر نشوونما پا رہی ہیں۔ یعنی اقبال آج اپنے شعری مجموعوں و محققین کی کتابوں، مقالوں اور رسائل تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ سیلِ تاریخ کی ہر موج کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اسے کہتے ہیں حیاتِ دوام!

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں، اُن کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

ادارہ

عہدِ نبویؐ میں سفارتی تنظیم

محمد یوسف فاروقی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

(۲)

سفیرِ رسولؐ نجاشی کے دربار میں شاہ حبشہ اصحمہ نجاشی کے پاس حضرت عمرو بن امیہ ضمری نے سفارتی فرائض انجام دیے۔ نجاشی مذہباً عیسائی تھا۔ ۵ نبوی میں جب کچھ مسلمان ہجرت کر کے حبشہ آ گئے تھے تو اہلِ مکہ نے نجاشی پر سفارتی ذرائع سے دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ ان مسلمانوں کو واپس لا سکیں یا کم از کم نجاشی انہیں سرزمین حبشہ سے نکال دے۔ لیکن مسلمانوں کے نمائندوں سے گفتگو اور حضرت جعفر طیار کی تقریر سے وہ متاثر ہو چکا تھا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیغام حق ہے اور یہ وہی پیغام ہے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام لائے تھے — اب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے باقاعدہ سفیر دعوتِ حق لے کر آ گئے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی نجاشی کو پیش کیا۔ اور بہت خوب صورت و بلیغ انداز میں شاہ حبشہ سے گفتگو کی[1]۔ نجاشی نے آپ کے مکتوب کو بڑے ادب و احترام کے ساتھ پڑھا۔ خط پڑھ کر جواب لکھوایا جس میں اس نے اپنے قبولِ اسلام کا اعتراف کیا۔ اس نے لکھا کہ میں نے آپ کے سفیر کے ہاتھ پر آپؐ کی بیعت کر لی ہے[2]۔

---

[1] ابن سید الناس عیون الاثر جلد ۲ ص ۲۶۴

[2] السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ ص ۲۹۳

مصر کے لیے سفارت مملکت مصر کے حاکم مقوقس کے پاس حضرت حاطب بن بلتعہؓ رسول اللہ کے سفیر بن کر آئے۔ مقوقس نے آپ کے سفیر کا بڑا اعزاز کیا۔ حاطب ابن ابی بلتعہ نے نبی اکرمؐ کا پیغام پہنچایا اور اسلام و پیغمبر اسلام کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔

شاہِ مصر مملکتِ اسلامیہ کے سفیر سے گفتگو کر کے متاثر ہوا اور اُس نے ان الفاظ سے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔

"احسنت انت حکیم جاء من عند حکیم

تم نے بہت اچھی بات کی ہے۔ تم ذہین و سمجھدار انسان ہو اور ایک دانا و حکیم کی جانب سے آئے ہو[۱]

مصر میں قبطیوں کا یہ حکمران خود مختار نہ تھا بلکہ رُومی سلطنت کے زیر اثر تھا۔ اُسے یہ جراٴت تو نہ ہوئی کہ آپ کی دعوت کو بے جھجک قبول کر لیتا۔ حاکم مصر نے اس مکتوب کا جواب دیا جس میں خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا۔ اُس نے رسول اللہ کو بہت سے تحائف بھی بھیجے[۲]

بحرین سے سفارتی رابطہ حاکم بحرین کے ساتھ بھی سفارتی سطح پر رابطہ قائم ہوا۔ منذر بن سادی اس زمانہ میں بحرین کا حاکم تھا، جو مجوسیت کا پیروکار تھا۔ حضرت علاء بن حضرمی نے سفارتی فرائض انجام دیے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی پہنچایا۔ شاہ بحرین نے آپ کا مکتوب بہت غور سے پڑھا۔ آپؐ کے سفیر سے باتیں کیں اور بالآخر اسلام قبول کر لیا۔ اُس نے بحرین کے عوام کو بھی رسول اللہؐ کا مکتوب پڑھوایا۔ بحرین میں مجوسیوں اور یہودیوں کی آبادی تھی۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ منذر بن سادی نے رسول اللہؐ سے خط کے ذریعے ایک سیاسی الجھن کے بارے میں دریافت کیا جو ارکان حکومت اور رعایا کے بہت سے افراد کے قبول اسلام کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ وہ یہ کہ اب غیر مسلم رعایا کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہوگا؟[۳]

---

[۱] السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ ص ۲۹۳

[۲] السہیلی، روض الانف جلد ۲ ص ۲۵۵ - السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ ص ۲۹۵ و ۲۹۸ عیون الاثر جلد ۲ ص ۲۶۵

[۳] السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ ص ۳۰۰ - عیون الاثر جلد ۲ ص ۲۶۶ - روض الانف جلد ۲ ص ۲۵۶

سلطنت عمان کے لیے سفارت

سلطنت عمان میں جلندی حکمران تھا، لیکن عملاً اس کے دو بیٹے عبد اور جیفر حکمرانی کر رہے تھے۔ ان دونوں کے پاس حضرت عمرو بن العاصؓ کو سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ حضرت عمرو بن العاص خود ایک بہت بڑے سردار کے بیٹے تھے۔ ان کے والد کی قائدانہ صلاحیتوں کا سارا عرب معترف تھا۔ حضرت عمرو بن العاص عمان پہنچے تو پہلے عبد بن جلندی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ عبد بن جلندی بہت خوش اخلاق، بردبار اور سلیم الطبع انسان تھا۔ اس نے دین اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کیں، اس کے علاوہ اس دور کی بین الاقوامی سیاست اور دیگر حکمرانوں کے اسلام کے بارے میں طرزِ عمل سے متعلق سوالات کیے۔ مثلاً اُس نے شاہ حبشہ کے بارے میں سوال کیا کہ کیا اُسے بھی اسلام کی دعوت دی گئی ہے؟ اگر اُسے دعوتِ دین دی گئی ہے تو اُس پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا؟ نجاشی کے اسلام قبول کرنے کا اس کی رعایا پر کیا ہوا؟ مملکت حبشہ کے پادریوں اور راہبوں نے اپنے بادشاہ کے قبولِ اسلام پر کس قسم کے ردِ عمل کا مظاہرہ کیا؟ کیا روم کے بادشاہ ہرقل کو بھی نجاشی کے قبولِ اسلام کی اطلاع مل گئی؟ اطلاع ملنے پر ہرقل نے سلطنتِ حبشہ کے خلاف کوئی کارروائی کی؟[1] حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس کے تمام سوالات کے جواب دیے اور اُسے خاصا مطمئن پایا۔ بعد میں اس کے بڑے بھائی جیفر کے ساتھ بھی گفتگو ہوئی۔ یہ سلسلۂ مذاکرات کئی روز تک جاری رہا۔ جیفر و عبد کی معاونت کے لیے اُن کی مملکت کے دیگر اہم ارکان اور مشیر بھی شریک رہے۔ یہاں تک کہ یہ دونوں حکمران اسلام کے بارے میں مطمئن ہو گئے اور اسلام قبول کر لیا۔[2] الاصابہ میں جلندی کے کچھ اشعار منقول ہیں جو انہوں نے اپنے قبولِ اسلام کے سلسلے میں کہے تھے۔ اشعار یہ ہیں:

اتانی عمرو بالتی لیس بعدها

من الحق شیئٌ والنصیح نصیح

---

[1] ان سوالات سے عبد جلندی کی سیاسی بصیرت اور ذہانت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

[2] السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ ص ۳۰۱ تا ۳۰۳، عیون الاثر جلد ۲ ص ۲۶۷
روض الانف جلد ۲ ص ۳۵۶۔

فیا عمرو قد اسلمت للّٰہ جھرۃ

ینادی بھا فی الوادیین فصیح[1]

"عمرو میرے پاس حق وصداقت کا وہ پیغام لائے ہیں جس کے بعد حق وصداقت کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔ اور خیر خواہ انسان تو خیر خواہ ہی ہوتا ہے۔

اے عمرو! میں کھلم کھلا اللہ تعالیٰ پہ ایمان لے آیا ہوں۔ میرے ایمان کا اعلان ان دونوں وادیوں میں ایک فصیح وبلیغ آواز بلند کرے گا۔

یمامہ کی طرف ترسیل سفر یمامہ کے امیر ہوذہ بن علی کے ساتھ سفارتی رابطے کے لیے حضرت سلیط بن عمرو عامریؓ کا انتخاب ہوا۔ انہیں اس لیے یمامہ کی سفارت کے لیے منتخب کیا گیا تھا کہ وہ اکثر وہاں جاتے رہتے تھے۔ وہاں کے حالات اور لوگوں سے واقف تھے[2] سلیط بن عمروؓ نے امیر یمامہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پہنچایا اور دینِ اسلام کے بارے میں وضاحت سے بتایا۔ ہوذہ بن علی نے سفیر رسول اللہ کو باعزاز واحترام کے ساتھ ٹھہرایا۔ رسول اللہ کے مکتوب گرامی کو غور سے پڑھا۔ اُس نے اِس بات کا اعتراف کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کی دعوت دے رہے ہیں، وہ بہت اچھا دین ہے۔ اس اعتراف کے بعد ہوذہ نے حضرت سلیط بن عمرو سے کہا کہ دیکھو میں صرف حاکم ہی نہیں بلکہ اپنی قوم کا شاعر اور خطیب بھی ہوں۔ عرب مجھ سے ڈرتے ہیں اور میرے مقام ومرتبہ کو پہچانتے ہیں، لہٰذا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے حکومت میں شریک کریں تو میں اسلام قبول کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے کو تیار ہوں۔ ہوذہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام یہ پیغام دیا اور سفیر رسول اللہ کو خلعت وتحائف دے کر واپس روانہ کیا۔ حضرت سلیط بن عمروؓ واپس تشریف لائے اور امیر یمامہ کا پیغام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر یمامہ کے سیاسی اسلام کو قبول نہیں کیا۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا" اگر وہ بالشت بھر

---

[1] الاصابہ جلد ۱ ص ۲۶۲ -

[2] السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ ص ۳۰۳

زمین مانگے گا تو وہ بھی نہیں دوں گا۔ ہو وہ خود بھی تباہ ہوا اور اُس کا مُلک بھی تباہ ہوا[۱]۔

دمشق سے رابطہ دمشق میں حارث بن شمر غسانی حکمران تھا۔ اس کے پاس حضرت شجاع بن وہب اسدیؓ کو پیغام دیکر بھیجا۔ دمشق کی حکومت سلطنت رُوما کے ماتحت تھی۔ حضرت شجاع بن وہب نے دمشق پہنچنے کے بعد پہلے اُس کے حفاظتی عملے کے افسران سے ملاقات کی اور دورانِ گفتگو ان سے حاکم دمشق کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں۔ یہ بات بھی انہیں حفاظتی عملے کے افسران کے ذریعہ معلوم ہوگئی تھی کہ حارث کوئی آزادانہ فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ قیصر روم سے بہت ڈرتا ہے[۲]۔ مملکتِ اسلامیہ کے سفیر نے بعد میں امیر دمشق سے ملاقات کی اور اُسے رسول اللہؐ کا پیغام پہنچایا۔ حارث نے خط پڑھنے کے بعد درشت اور ناروا ردِّ عمل کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے کہا کہ بھلا مجھ سے حکومت کون چھین سکتا ہے۔ رسول اللہؐ کے سفیر سے یہ بات کہہ کر اُس نے مملکتِ مدینہ کے خلاف جنگی تیاری کا حکم دے دیا۔ ساتھ ہی قیصر روم کو بھی جنگی کارروائی کی اجازت حاصل کرنے کے لیے لکھ بھیجا۔ قیصرِ روم کے پاس حاکم دمشق کا قاصد پیغام لے کر فوری طور پر روانہ ہوگیا۔ یہ اُسی زمانے کا واقعہ ہے جب قیصر روم کو حضرت دحیہ کلبیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی قسم کا پیغام پہنچا چکے تھے۔ جب حارث غسانی کا قاصد شاہِ روم کے پاس پہنچا اور اس نے تمام واقعات سے قیصر کو آگاہ کر کے جنگی کارروائی کی اجازت چاہی تو قیصر رُوم نے حاکم دمشق کو فوج کشی کے ارادہ سے منع کر دیا اور اسے حکم دیا کہ وہ بیت المقدس میں ملک روم کے استقبال کی تیاریاں کرے۔ حارث غسانی کو تو رُوم کی طاقت پر گھمنڈ تھا۔ جب اُس نے یہ محسوس کیا کہ قیصر روم بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خوف زدہ ہے تو اُس نے فوج کشی کا ارادہ ترک کر دیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے کو بُلا کر سَو مثقال سونا بطور تحفہ دے کر روانہ کیا[۳]۔

دوسری متفرق سفارتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بڑے بڑے حکمرانوں کے علاوہ اور بھی

---

[۱] السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ ص ۳۰۴ - عیون الاثر جلد ۲ ص ۲۶۹ - زاد المعاد جلد ۳ ص ۶۳

[۲] ایضاً 〃 ص ۳۰۵ - حفاظتی عملے کے افسر نے یہ الفاظ کہے تھے۔ "ھو یخاف قیصر"

[۳] زرقانی جلد ۳ ص ۳۵۶ - عیون الاثر جلد ۲ ص ۲۷۰ - السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ ص ۳۰۴

بہت سے قبائل کے سرداروں، ریاستوں کے حکمرانوں اور سیاسی قیادت رکھنے والی شخصیتوں سے سفارتی رابطے قائم کیے۔ مثلاً یمن کے بادشاہ حارث بن عبد کلالی کے پاس مہاجر بن امیہ مخزومی کو بھیجا۔[1] قبیلہ بنو کلاب کے سردار سمعان بن قریط کے پاس حضرت عبداللہ بن عوسجہ عرنی کو، بکر بن وائل کے پاس ظبیان بن مرثد کو، قبیلہ حمیر کے رؤسا حارث، مسروح اور نعیم بن عبد کلال کے پاس حضرت عیاش بن ربیعہ کو، طائف کے مشہور قبیلہ بنو ثقیف کے پاس نمیر بن خرشہ کو، مسیلمہ کذاب کے پاس سائب بن عوام کو اور حضرت وائل بن حجرؓ کو خود ان کے قبیلہ کے لوگوں کے پاس دے کر بھیجا۔[2]

سفارتی رابطوں کے اثرات عہد نبوی میں سفارتی ذرائع سے مختلف ممالک کے حکمرانوں اور اقوام کے ساتھ رابطہ قائم کرتے، اُن میں دعوتِ دین اور اشاعتِ حق کے لیے کام کرنے کے بہت دُور رس نتائج برآمد ہوئے۔ سب سے اہم فائدہ تو یہی ہوا کہ بہت سے حکمرانوں، قبائل کے سرداروں اور سیاسی رہنماؤں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور دعوتِ دین کے کام میں خود بھی شریک ہوگئے۔ معاشرے کے ان بااثر شخصیتوں کے قبولِ اسلام کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی رعایا اور اُن کے زیرِ اثر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

بعض حکمرانوں نے اگرچہ اسلام تو قبول نہیں کیا۔ لیکن اس دعوت نے انہیں جھنجھوڑا ضرور۔ وہ اس دین کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوئے۔ اس کی حقانیت اور صداقت کا تصوّر بھی اُن کے دل و دماغ میں اُبھرتا رہا۔ یہ بات بھی ذہنی طور پر ماننے کے لیے مجبور تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دینِ اسلام کی دعوت کا کام مکمل طور پر اللہ کے لیے پورے خلوص سے کر رہے ہیں۔ مُلکوں اور علاقوں پر قبضہ کرنا یا اپنی مملکت کی سرحدوں کو وسیع کرنا اُن کا مقصد نہیں، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام قبول کرنے والے حکمرانوں یا قبائلی سرداروں کو حکومت و قیادت سے برطرف نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ انہی

---

[1] ابن ہشام - سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۲۷۸، ابن سید الناس، عیون الاثر جلد ۲ ص ۲۵۹

[2] طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۳۲ تا ۷۵۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے امراء اور سرداروں سے رابطہ قائم کیا۔ طبری، ابن سعد اور ابن کثیر میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس مختصر مقالہ میں طوالت کے پیش نظر ہم نے اُن کا تذکرہ نہیں کیا۔

لوگوں کو اپنے مناصب پر برقرار رکھتے تھے۔

دعوتِ دین کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے مثال عزم واستقامت نے بھی اس دور کے بہت سے حکمرانوں کو یہ بات سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آج جس اعتماد و یقین کے ساتھ اسلام کی دعوت دے رہے ہیں مستقبل میں یہ دین ضرور غالب و کامیاب ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ بہت سے حکمرانوں نے رسول اللہ کے ان سفیروں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا، انہیں تحائف پیش کیے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تحفے بھیج کر خیرسگالی کے جذبات کا اظہار کیا۔ یہ حکمران کم از کم دوستانہ تعلقات ضرور چاہتے تھے ـــ صرف فارس کے شہنشاہ کسریٰ اور ایک اور حکمران نے ان سفیروں کے ساتھ بدسلوکی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبِ گرامی کے جواب میں ناروا ردّعمل کا مظاہرہ کیا۔

ایک اور بڑا فائدہ ان سفارتی سرگرمیوں کا یہ ہوا کہ ان حکمرانوں کے جوابات اور ان کے ردّعمل نے اُن کے مقاصد اور سیاسی عزائم کو واضح کر دیا۔ جن کی روشنی میں مملکتِ اسلامیہ کے لیے ان کے ساتھ مستقبل کی پالیسی مرتب کرنا اور اُن کے ساتھ آئندہ تعلقات کی نوعیت متعین کرنا آسان ہوگیا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سفیروں کے ساتھ طرزِ عمل

تاریخ کی کتابوں اور قدیم ادبیاتِ جاہلیت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی یہ قانون تو موجود تھا کہ سفارتی نمائندوں سے اچھا برتاؤ کرنا چاہیے، اُن کے ساتھ بدسلوکی یا ایذا رسانی سے گریز کرنا چاہیے۔ لیکن اس قانون پر پوری طرح عمل درآمد نہیں کیا جاتا تھا۔ سفیروں کے ساتھ غیر مہذب سلوک ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ انہیں یرغمال بنانے اور قتل تک کر ڈالنے کی بے شمار مثالیں تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں۔ بہت سے مسلمان سفیروں کے ساتھ بھی ناروا سلوک ہوتا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض نمائندوں کو قتل بھی کیا گیا لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سفارتی آداب ملحوظ رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ آپ خود بھی سفیروں کے ساتھ اعزاز و احترام کا سلوک کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی بات کا حکم دیتے تھے۔

مدینہ منورہ میں آنے والے سفرا اور وفود کو عزت و احترام کے ساتھ خوش آمدید کہتے اور ان کا استقبال پورے اعزاز کے ساتھ کرتے تھے۔ عزت و احترام کے ساتھ ہی معاملہ نہ تھا، اُن کے ساتھ اس قدر رواداری کا مظاہرہ فرماتے تھے کہ ان کی بہت سی نازیبا اور ناقابلِ برداشت حرکتیں بھی تحمل اور

خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر لیتے تھے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ سب سے بدترین وفد عامر بن طفیل کا وفد تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا۔ یہ وفد تین افراد پر مشتمل تھا۔ عامر بن طفیل، اربد بن قیس اور جبار بن سلمٰی، عامر بن طفیل اس وفد کا قائد تھا۔ یہ تینوں افراد سردارانِ قوم تھے۔ ان کی حرکتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے عزائم ٹھیک نہیں تھے۔ عامر بن طفیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت غیر مہذب بلکہ گستاخانہ انداز میں گفتگو کی، اور جب یہ وفد واپس جانے لگا تو یہ دھمکی بھی دی کہ وہ اپنے مسلح لشکروں کے ذریعے مدینہ کی بستی کو تہس نہس کر دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تمام بدسلوکی کے باوجود اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ اور اسے سفیروں کی طرح رخصت کیا۔ اس کے جانے کے بعد آپؐ نے یہ دعا کی کہ اے اللہ تو عامر کے فتنوں سے ہمیں محفوظ رکھ۔[1]

مسیلمہ کذاب نے بھی اپنا نمائندہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا تھا۔ مسیلمہ کذاب کے کچھ سیاسی عزائم تھے۔ وہ رسول اللہؐ سے یہ چاہتا تھا کہ نصف حکومت اس کے حوالے کر دیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے دعویٰ نبوت بھی کیا۔ مسیلمہ کذّاب کے نمائندے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو انہوں نے تمام آداب و اخلاق کو نظرانداز کر دیا۔ ان لوگوں نے بڑی بدتمیزی اور شرارت کا مظاہرہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تمام بدتمیزی کے باوجود اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ فرماتے رہے۔ جب انہوں نے تمام اخلاقی حدود کو پامال کر دیا تو رسول اللہ علیہ وسلم نے انہیں رخصت کر دیا اور صرف یہ فرمایا:

انا واللہ لولا ان الرسل لا تقتل لضربت اعناقکما۔[2]	خدا کی قسم اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سفیروں کا قتل جائز نہیں، تو میں ضرور تمہاری گردن اُڑوا دیتا۔

نجران کے عیسائیوں کا ایک بہت بڑا وفد مدینہ منورہ آیا۔ یہ وفد ساٹھ افراد پر مشتمل تھا، جس کی قیادت

[1] ابن سید الناس۔ عیون الاثر جلد ۲ ص ۲۳۲۔ زاد المعاد جلد ۳ ص ۲۹

[2] سیرت ابن ہشام جلد ۴ ص ۲۶۲۔

عبدالمسیح کر رہا تھا۔ اس وفد کو مسجد نبوی میں ٹھیرایا گیا۔ جب اُن لوگوں کی نماز کا وقت ہوا تو انہوں نے مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا چاہی۔ یہ لوگ بیت المقدس کی جانب منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ جب مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ لوگ اپنے مسلک عیسائیت کے مطابق بیت المقدس کی جانب منہ کر کے ہماری مسجد میں نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو لوگوں نے انہیں روکنا چاہا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو منع کر دیا۔ اور اس وفد کو اپنے مذہب کے مطابق نماز پڑھنے کی اجازت دی۔ چنانچہ انہوں نے مسجد نبوی میں مذہب عیسائیت کے مطابق نماز ادا کی[1]

طائف سے قبیلہ بنو ثقیف کا وفد مدینہ منورہ آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بڑی عزت و احترام کے ساتھ ٹھیرایا۔ مسجد نبوی میں ان کے قیام کے لیے خیمے لگوائے۔ ان کے ساتھ مذاکرات اور اُن کی ضیافت کے لیے حضرت خالد بن سعید بن العاص کو خاص طور پر افسر رابطہ و ضیافت مقرر فرمایا[2]

مدینہ منورہ آنے والے سفرا اور وفود کے ساتھ اس خصوصی اعزاز و احترام کے علاوہ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اُن کی مالی خدمت بھی کی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ قبیلہ مزینہ کا وفد واپس جانے لگا تو اُس کے پاس زادِ راہ نہیں تھا۔ اُن کی واپسی کے سفر میں کھانے پینے کے انتظامات مملکتِ مدینہ نے کیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضؓ کو حکم دیا کہ ان لوگوں کے لیے زادِ راہ کا انتظام کریں[3]

اسی طرح بنو ثعلبہ کا وفد جب واپس روانہ ہونے لگا تو اس وفد کے تمام افراد کو پانچ پانچ اوقیہ چاندی دینے کا حکم صادر فرمایا[4] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ سفیروں کے ساتھ اعزاز و اکرام کا سلوک کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ

[1] السیرۃ الحلبیہ جلد ۲ ص ۲۳۵

[2] عیون الاثر جلد ۲ ص ۲۲۹ - السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ ص ۲۴۲، ۲۴۳

[3] الخصائص الکبریٰ جلد ۲ ص ۲۳

[4] الطبقات الکبریٰ جلد ۱ ص ۲۹۸

یہ تھے۔

اجزھم کما تجیز الوفد[۱]

ان لوگوں کے ساتھ (وفد بنو ثعلبہ) اسی طرح خاطر مدارات کرو جس طرح وفود کے ساتھ خاطر مدارات کی جاتی ہے۔

سفرا کے تحفظ، ان کے اعزاز و اکرام اور ان کی مدارات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سر فہرست رکھا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفیروں کے ساتھ بہتر برتاؤ کے لیے خاص طور پر وصیت فرمائی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ان وفود کا احترام اور ان کی مدارات اسی طرح کرتے رہنا، جس طرح میں کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ تھے:

اجیزوا الوفد بنحو مما کنت اجیزھم[۲]

بیرونی وفود کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنا جس طرح میں کرتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے حکموں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سفرا کے حقوق کا تعین کر دیا ہے۔ کوئی اسلامی مملکت ان میں کمی نہیں کر سکتی۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

---

[۱] الطبقات الکبریٰ جلد ۱ ص ۲۹۸

[۲] الطبقات الکبریٰ جلد ۲ ص ۲۴۲

عقل ——— انعامِ خداوندی

پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

سب سے بڑا انعام جو بارگاہِ خداوندی سے ارضی خلیفہ انسان کو عطا ہوا ہے وہ عقل اور فہم ہے ۔ انسانیت کا شرف عقل سے عبارت ہے ۔ تکلیفاتِ شرعیہ کا مدار عقل پر ہے ۔ صاحبِ عقل مکلّف ہے اور مجنون و دیوانہ سے ہر قسم کی ذمہ داریاں ساقط ہیں ۔ انسان جتنا زیادہ عقیل و فہیم ہے اتنا ہی زیادہ اس کا درجہ اور مرتبہ بلند ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ افضل الناسِ اعقل الناس ۔ بہترین انسان وہ ہے جو زیادہ عقل مند ہے ۔ دُنیا میں کارِ خلافت انجام دینے کے لیے انسان کو عقل جیسے وسیلہ کی ضرورت ناگزیر تھی ۔ انسان کی کارگذاری درحقیقت عقل و فہم کی کارگزاری سے عبارت ہے ۔ دُنیا میں انسان کا سارا عروج ، ساری ترقیاں اور ساری فتوحات عقل و فہم کی رہینِ منت ہیں ۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو قسم کی عقل سے نوازا ہے ۔ دین کی زبان میں ایک کو عقلِ معاش اور دوسری کو عقلِ معاد کہتے ہیں ۔ فلسفی ایک کو عقلِ تجزیاتی اور استدلالی اور دوسری کو عقلِ کلّی یا تخلیقی کہتے ہیں ۔ صوفیہ کرام کی دلچسپی دوسری عقل سے زیادہ ہے ۔ وہ اس کو کشف یا وجدان سے تعبیر کرتے ہیں ۔ شاعروں کا تعلق بھی دوسری عقل سے زیادہ ہے ۔ وہ اس کو دل اور عشق کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں ؎

اک دانشِ نورانی ، اک دانشِ برہانی
ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

ان عقلوں کے رجحانات اور میلانات مختلف ہیں۔ پہلی عقل کا موضوع واقعات وحادثات کی طبعی مادّی دُنیا ہے۔ دوسری کا موضوع ان واقعات کی عیاری اور اخلاقی حیثیت کا تعین کرنا ہے۔ ایک کا رُخ خارجی دُنیا کی طرف ہے، وہ تسخیر کائنات پر مائل ہے۔ دوسری کا رُخ عالمِ مثال کی طرف ہے۔ وہ تقرب ذاتِ حقیقت کی طرف مائل ہے[1]۔ ایک کی ساری تگ ودو "کیا ہے" کے تحت آتی ہے۔ دوسری کی ساری کدوکاوش "کیا ہونا چاہیے" کے تحت آتی ہے۔

حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے۔ آپ نے فرمایا:

"العقل نور فی القلب، یفرق بین الحق والباطل"

عقل ایک نور ہے قلب کے اندر، جس کے ذریعہ حق اور باطل کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔

عقلِ استدلالی عام حالات میں اکیس سال کی عمر میں بلوغت کو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن عقلِ وجدانی چالیس کی عمر میں بالغ ہوتی ہے اور ساٹھ سال کی عمر میں پختگی کو پہنچتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جارج برنارڈ شا نے ولیم شیکسپیئر کو ناپختہ ذہن قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کا انتقال ستاون سال کی عمر میں ہوگیا تھا[2]۔

عقل استدلالی میں ایک غبی آدمی سے لے کر حکیم و دانا تک سینکڑوں درجات اور مراتب ہیں۔ اسی طرح عقل وجدانی میں عام آدمی سے لے کر فن کاروں، شاعروں اور عارفینِ کاملین تک ہزارہا درجات و مراتب ہیں۔

عقلِ استدلالی ہو یا عقلِ وجدانی، دونوں کی آبیاری اسی عالمِ رنگ و بو میں ہوتی ہے۔ یہیں وہ مدارجِ عالیہ طے کرتی ہیں، جو کچھ فرق ہے وہ نقطۂ نظر کا ہے۔ شے ایک ہوتی ہے، مختلف افراد مختلف سبق حاصل کرتے ہیں۔ چمن میں گلاب کا پھول کھلا ہوا ہے۔ ایک عطار دیکھ کر کہتا ہے کہ اس کا گلقند بہت

---

[1] عقلِ استدلالی کے بیانات زمان و مکان، کمیت و کیفیت کے حدود میں دائر رہتے ہیں۔ عقل وجدانی کے بیانات اس محدودیت سے آزاد ہوتے ہیں۔

[2] غالباً اسی وجہ سے محقق طوسی ایک عالم کو چالیس سال کی عمر کے بعد اور پندرہ سال کے تدریسی تجربہ کے بعد قلم اٹھانے اور کتاب لکھنے کا حق دیتے ہیں۔

اچھا بن سکتا ہے۔ ایک شاعر اُس کی نزاکت اور رعنائی میں اپنے محبوب کی جھلک دیکھ لیتا ہے۔

ے نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

ایک عارف اُس کی حسن و رعنائی میں خالق کی صناعی کا عکس دیکھ لیتا ہے۔

ے برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

سارا اختلاف نقطۂ نظر کا ہے، نظر کے ارتقائی مدارج کا ہے اور منبعِ علم کا ہے۔

ے آدمی دیداست باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

عقلِ استدلالی انسان صرف ان سرگرمیوں اور دلچسپیوں کو مستقلاً اور دائماً جاری رکھتا ہے، جن کا مبنیٰ اور اساس اُس کی فطرت میں موجود ہے۔ جو روزِ ازل اُس کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ عقلِ استدلالی کا مبنیٰ انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

"ہم نے انسان کو سُننے والا اور دیکھنے والا بنایا" (دہر - ۴)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حواسِ خمسہ عطا کیے ہیں۔ جو شعور کے لیے بمنزلہ دروازوں کے ہیں۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے؛

"اُس نے (اللہ نے) آدمؑ کو تمام اشیا کے نام سکھا دیے" (بقرہ - ۳۱)

نام سیکھنے کے لیے ذہن کو کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اشیا کو محسوس کرنا، ذہن میں اُن کے نقوش کا مرتسم ہونا، ان تصورات کو جدا جدا ناموں سے یاد کرنا۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تصور اور تخیل کی ذہنی قوتوں سے نوازا ہے۔ یہ قوتیں عقلِ حسّی کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ گویا عقلِ حسّی اور عقلِ تجزیاتی کی بنیاد اور اساس اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کی فطرت میں ودیعت کر دی ہے۔ حواس کے ذریعے اشیا کا علم و ادراک حاصل کرنا تمام افرادِ بشری کا خاصہ ہے۔ کوئی فردِ بشر اس نعمت سے محروم نہیں ہے۔ ادراک، تفکر اور تدبّر درحقیقت تصورات کے ہی اعلیٰ مراتب ہیں۔ عقل کی سرگرمی ہی تفکر اور تدبر ہے۔ زندگی کے معاملات انسان اسی عقل

کے وسیلہ سے انجام دیتا ہے۔

انسانوں کی بہت بڑی اکثریت ابتدائی مرحلہ یعنی عقلِ حسی پر ہی قناعت کر لیتی ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے مادی ماحول ہی میں مگن رہتی ہے۔ لیکن ایک قلیل تعداد عقلِ حسی پر قانع نہیں رہتی، وہ مزید ترقی کرتی ہے اور عقلِ استدلالی تک جا پہنچتی ہے۔ حواس جو معلومات فراہم کرکے دیتے ہیں عقلِ استدلالی ان کا تجزیہ کرتی ہے، تحلیل کرتی ہے۔ مزید برآں پھر ان اجزاء کو حسبِ منشا نئے انداز اور نئے طریقوں سے ترتیب دیتی ہے۔ اس طرح وہ نئے نئے نتائج اخذ کرتی رہتی ہے اور نئی نئی معلومات دریافت کرتی رہتی ہے۔ عقلِ استدلالی کا یہی وظیفہ ہے۔

یہ عقل نوعِ انسانی کے ہاتھوں میں نہایت کارآمد وسیلہ ہے۔ اس کی مدد سے انسان نے مادی اشیا کو سمجھا ہے۔ مادی ماحول کو مسخر کیا ہے۔ صدیوں سے نوعِ انسانی مادی اشیا کو سمجھنے اور مادی ماحول کو مسخر کرنے کے درپے ہے۔ اس طول طویل جدوجہد کے نتیجے میں مادی اشیا سے متعلق ایک عظیم الشان ذخیرۂ معلومات نوعِ انسانی کے پاس جمع ہوگیا ہے۔ اس کے بل بوتہ پر اب وہ خارجی مادی ماحول پر حاکمانہ انداز میں قابض اور متصرف ہے۔ آج وہ مادہ پر حکومت کر رہا ہے، اس کو اپنے حسبِ منشا استعمال کر رہا ہے۔ وہ ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ وہ پانی میں تیر رہا ہے اور پہاڑوں کے جگر چیر رہا ہے۔ علوم و فنون کی عظیم الشان گرم بازاری، تہذیب و تمدن کی حیرت انگیز چمک دمک اور تصرف و اقتدار کا محیر العقول سر رشتہ سب اسی عقلِ استدلالی کا نبار کردہ ہے۔ دنیا کی موجودہ بہار عقلِ استدلالی کی لگائی ہوئی ہے۔ آج ہر جگہ عقلِ استدلالی کی حکمرانی اور بالادستی ہے۔

بلاشبہ عقلِ استدلالی اور عقلِ تدبیری عالمِ رنگ و بو — مادی دنیا — میں حد درجہ کامیاب اور بامراد ہے۔ عالمِ مادیات کی گتھیاں عقلِ تدبیری کے ناخن سے حل ہوسکتی ہیں۔ لیکن عالمِ مابعد الطبیعات عالمِ ماوراء مادہ میں عقلِ استدلالی درماندہ اور عاجز ہے۔ عالمِ مغیبات میں عقلِ استدلالی کا رہوار نہیں دوڑتا۔ وہاں اس کے پر جلتے ہیں۔

سارے عالم میں سیادت عقل کی
دل الجھتا ہے مگر سرّ و عیاں

کمال سنانیری شہیدؒ

شخصیت و کردار

جناب خلیل احمد الحامدی صاحب

کمال سنانیری رحمۃ اللہ علیہ سے راقم کی پہلی ملاقات ۱۹۷۲ء میں کویت میں کویت کی وزارتِ اوقاف کے شعبۂ امورِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر استاد عبداللہ عقیل کی دیوانیہ[1] میں ہوئی۔ موصوف رہائی کے بعد پہلی مرتبہ قاہرہ سے کویت آئے تھے۔ دیوانیہ میں انہوں نے اخوان المسلمون کی دعوت اور کردار کے موضوع پر تقریر کی۔ تقریر کا انداز ایسا عاجزانہ تھا کہ کہیں اُس میں خودستائی و خودنمائی نہ تھی۔ اور خاص طور پر انہوں نے جیل میں دی جانے والی اذیت و تعذیب کا اشارۃً بھی ذکر نہ کیا، حالانکہ حاضرین کو سب سے زیادہ جو بات معلوم کرنے کی خواہش تھی، وہ اُن کی جیل کی زندگی تھی۔ انہوں نے یہ کہہ کر اپنی بیس سالہ جیل کی زندگی کو تقریر سے خارج کر دیا کہ "جیل میں ہم نے جو وقت گزارا اور جس انداز میں گزارا وہ صرف اللہ کے لیے تھا۔ اور ہم اللہ تعالیٰ ہی سے اس کے اجر کے طلب گار ہیں۔" البتہ وہ اپنے رفقاء کے عمومی کردار و عزیمت اور صبر و جگرداری کی ستائش کرتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ اخوان المسلمون کے وہ تمام افراد جو سالوں تک جیل میں رہے ہیں اور گوناگوں آزمائشوں میں ڈالے جاتے رہے ہیں، وہ یہ

[1] کویت میں وہاں کے اکثر اہل علم و اہل وجاہت لوگ اپنے گھروں میں ایک وسیع کمرہ بنا لیتے ہیں، اُسے دیوانیہ کہتے ہیں جیسے پنجاب میں بیٹھک۔ کویت کی یہ دیوانیات زندگی اور زندہ دلی کا مرقع ہوتی ہیں۔ ہفتہ وار اُن میں مجلسیں ہوتی ہیں۔ زندگی کے تمام معاشرتی اور سیاسی مسائل وہاں زیر بحث آتے رہتے ہیں۔ یہ دیوانیات کویتی معاشرے پر غیر معمولی حد تک اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔

سمجھتے ہیں کہ اُن پر جو کچھ بیتی ہے، وہ مِحْنَۃٌ (آزمائش و ابتلاء) نہیں ہے بلکہ مِنْحَۃٌ (انعام و عطیہ) ہے۔ کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں اُن کے ذاتی کردار کو مضبوط اور جماعتی وقار میں اضافہ کر دیا ہے اور آخرت میں انہیں خوشنودیٔ رب کے حصول کا یقین ہے۔

اس پہلی ملاقات کے بعد پھر بارہا کمال شہید سے ملاقاتیں ہوئیں۔ پاکستان بھی وہ تین بار تشریف لائے اور آخری مرتبہ تو وہ تقریباً ڈیڑھ ماہ پاکستان میں رہے۔ وہ لاہور اور پشاور جہاں جہاں رہے دوستوں اور ملنے والوں کے دلوں میں اپنی حسین یادوں کے انبار چھوڑ گئے۔ اُن کی مثال گلِ خوش رنگ کی تھی۔ وہ خود کانٹوں کے درمیان جی رہے تھے۔ مگر دوسروں کے لیے وہ سراسر لطف و انکساری اور سراسر خوشبو تھے۔ میں سوچتا رہتا ہوں کہ وہ کون سنگدل جلاد ہوگا جس نے کمال جیسے شریف، درویش صفت اور پیکرِ صدق و صفا انسان پر ہاتھ اُٹھایا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ جس جلاد نے کمال کا گلا دبوچا ہوگا (کمال کے اہلِ خانہ نے بتایا ہے کہ جب لاش اُن کے سپرد کی گئی تو اُن کی گردن پر سیاہ لکیر تھی) کمال اُسے نادم واپسیں یہی کہتے رہے ہوں گے کہ "ظالم خدا تجھے معاف کرے۔" کیونکہ کمال کا مزاج جذبۂ انتقام سے خالی اور زبان درشت کلامی سے نا آشنا تھی۔

راقم نے ہمیشہ کمال کو یہ دُعا سرّاً اور جہراً کرتے سنا کہ: "اے اللہ میری موت تیرے راستے میں شہادت کی موت ہو۔" وہ یہ دُعا بڑے جذب و شوق اور اخلاص و انہماک سے مانگا کرتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس روزِ سعید کا بڑی بے تابی و اضطراب کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔ جب وہ خدا کے دربار میں جامۂ شہادت پہنے حاضر ہوں۔ وہ اپنے ساتھی شہیدوں (عبدالقادر عودہ، سید قطب اور عبدالفتاح اسماعیل وغیرہم) کا بڑے رشک و ولولے سے ذکر کیا کرتے تھے۔ ان کی گرمیٔ رشک بتا رہی ہوتی تھی کہ اُن کی روح اُن کے ساتھی شہدا کی روحوں سے بڑی ہم آہنگ ہو چکی ہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے کمال کی دُعا قبول فرمائی اور ۱۳ محرم ۱۴۰۲ھ کو موصوف مصری جلادوں کے ظالمانہ تعذیب و تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر گئے۔ ایک طرف وہ قافلۂ شہداء میں شامل ہو کر جریدۂ عالم پر اپنا نقشِ دوام ثبت کر گئے اور دوسری طرف وہ ان بے رحم اور بدبخت ظالموں کے لیے دائمی لعنت و رسوائی کا داغ چھوڑ گئے جنہوں نے ۶۳ سال کے اس ولی و خدا پرست انسان کو جیل کے اندر بے بسی کی حالت میں اپنی درندگی و بہیمیت کا نشانہ بنایا۔

کمال سنانیری ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ وہ حسن البنا رحمۃ اللہ علیہ سے ۱۲ سال چھوٹے تھے۔ اخوان المسلمون کی تاسیس کے وقت ان کی عمر ۹ سال تھی۔ دارالعلوم قاہرہ میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اقتصادیات اُن کا مضمون تھا۔ جس زمانے میں وہ دارالعلوم قاہرہ کے طالب علم تھے۔ نہ صرف دارالعلوم قاہرہ بلکہ مصر کے تمام تعلیمی ادارے اخوان المسلمون کی دعوت سے اثر پذیر ہو رہے تھے۔ اخوان المسلمون کی تحریک کو جو بھی قابل ذکر اور قابلِ قدر کارکن ملے وہ تعلیمی اداروں ہی سے ملے۔ دینی تعلیم کی درسگاہوں کی نسبت جدید تعلیم کی درس گاہیں اخوان کی دعوت کو زیادہ شوق و ذوق سے قبول کر رہی تھیں۔ کمال ۱۹۴۱ء میں باقاعدہ تحریک شامل ہوئے۔ اُس وقت اُن کی عمر ۲۳ سال تھی۔ وہ فطرتاً باصلاحیت اور نیک منش تھے۔ اس پر مستزاد گھریلو تربیت تھی۔ وہ مصر کے ایک دیہاتی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اور اس بنا پر وہ سادگی، اخلاص اور وفاشعاری کی اُن تمام خوبیوں سے آراستہ تھے، جو مصری فلاحین اور مصر کے دیہی معاشرے کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔ اخوان المسلمون کی تحریک میں جب انہوں نے اپنے عنفوان شباب میں شمولیت کی تو پہلے ہی روز سے انہوں نے اپنی زندگی کا راستہ بدل لیا۔ اب وہ اصلاً تحریک و دعوت کے لیے تھے۔ اور بعد میں کسی اور پہلو کے لیے بے داغ جوانی کے ساتھ انہوں نے راہ حق میں قدم رکھا۔ اور پھر اپنی جوانی اور جوانی کے تمام ولولے اور امنگیں قربان کرتے ہوئے اپنے آپ کو اُسی طرح تحریک کا جزو لاینفک بنا دیا جس طرح قطرہ سمندر میں گر کر جزوِ سمندر بن جاتا ہے۔

کمال شہید کی تحریکی زندگی ۴۰ سال پر مشتمل ہے۔ ان چالیس سالوں میں سے ۲۰ سال انہوں نے جیل کی سلاخوں میں گزارے۔ اور ۲۰ سال جیل کے باہر جد و جہد اور دعوت و تبلیغ میں۔ وہ ۱۹۴۱ء میں تحریک میں داخل ہوئے اور پھر ۱۹۵۴ء میں وہ جمال عبدالناصر کے عہدِ نامسعود میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جیل میں ڈال دیے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں انہیں رہا ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ رہائی کی گھڑیاں گن رہے تھے کہ انہیں جیل میں یہ نئے احکام مل گئے کہ انہیں مزید دس سال کے لیے قید بامشقت دی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ دورانِ گفتگو راقم نے کمال شہید سے پوچھا کہ جب آپ کو گیارہ سال قید گزارنے کے بعد رہائی کی تیاری کے دوران یہ خبر ملی کہ دس سال مزید جیل کی کوٹھڑی گزارنے ہوں گے تو آپ کا کیا تاثر تھا؟" فرمانے لگے کہ ذہنی اور نفسیاتی طور پر ہماری یہ حالت ہو گئی تھی کہ نہ رہائی کے لیے

ہمارے اندر کوئی بے چینی تھی اور نہ مزید قید پر ہمیں کوئی ملال ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے دلوں کے اندر اطمینان و سکینت کا اس قدر نشہ پیدا کر رکھا تھا کہ ہم قید اور رہائی دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہ محسوس کرتے تھے"۔

بہرحال ۱۹۷۳ء میں انور سادات کے دور میں جب حالات میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور مصری عدلیہ کو قدرے آزادی کی فضا فراہم ہوئی تو اخوان قیدیوں کے ورثا نے عدالتوں میں درخواستیں دائر کرنا شروع کر دیں اور ان کے نتیجے میں اخوان قیدی رہا ہونا شروع ہوئے۔ ان میں کمال شہید بھی تھے۔

اخوان المسلمون کا طویل دورِ ابتلا (۱۹۵۴ء تا ۱۹۷۲ء) مصری تاریخ کا ایک اہم دور ہے۔ انور سادات کے عہدِ حکمرانی میں اس دور کے سیاہ اوراق کافی حد تک طشت از بام ہو چکے ہیں۔ اور یہ کوئی اب ڈھکی چھپی بات نہیں رہی کہ اس دور میں کس طرح قانون کی مٹی پلید کی گئی، اور کس قدر لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو لوٹا گیا، کس طرح ہر انسانی قدر اور ہر شریف پیکر کو پامال کیا گیا۔ اخوان کی قیادت کا ایک حصہ (عبدالقادر عودہ، یوسف طلعت، شیخ محمد فرغلی، ابراہیم الطیب، ہنداوی دویر) ۱۹۵۴ء کو نذرِ دار و رسن کر دیا گیا تھا۔ اور باقی ماندہ حصہ (سید قطب، یوسف ہواش، عبدالفتاح اسماعیل) ۱۹۶۵ء میں ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں جب اخوان المسلمون کی رہائی ہوئی تو مصر کے اندر اخوان کے صرف وہ لوگ رہ گئے تھے جو صفِ دوم کے لوگ تھے، لیکن اپنے اعلیٰ کردار، مضبوط سیرت اور تقویٰ و للٰہیت کی بدولت اب وہی قیادت کے منصب پر فائز ہوئے۔ ان حضرات میں جناب عمر تلمسانی، کمال سنانیری، مصطفیٰ مشہور، صلاح شادی، احمد حسن اور محمود عبدالحلیم سرِ فہرست ہیں۔ جناب عمر تلمسانی اخوان کے غیر رسمی[1] مرشدِ عام (سربراہ) ہیں۔ اور کمال سنانیری اور ان کے بعض اور ساتھی نائب مرشدِ عام اور دیگر ذمہ دارانہ مناصب پر فائز ہوئے۔ کمال سنانیری تو خدا کو پیارے ہو گئے ہیں۔ اور باقی قیادت ایک آدھ فرد کو چھوڑ کر، پھر جیل میں ڈال دی گئی ہے۔ ——— لطف کی بات یہ ہے کہ

---

[1] "غیر رسمی" کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ اخوان المسلمون کو آج تک مصر میں قانوناً بحال نہیں کیا گیا ہے۔ ابھی تک یہ تحریک خلافِ قانون ہے۔ اس لیے اخوان کے لوگ اپنی باقاعدہ تنظیم نہیں کر سکے اور نہ مختلف مناصب اور ذمہ داریوں کو سنبھالنے والوں کا رسماً اعلان کر سکے ہیں۔

یہ حضرات انور السادات کے قتل سے بہت پہلے جیل میں ڈال دیے گئے۔ اور اُن پر الزام یہ تھا کہ مسلمانوں اور قبطیوں کے مابین اسیوط میں اور مصر کی نواحی بستی الزاویۃ الحمراء میں جو فسادات ہوئے ہیں، اُن میں اخوان کا ہاتھ ہے۔ یہ الزام سراسر بے بنیاد تھا۔ اور خود حکومت اور عوام دونوں جانتے تھے کہ یہ الزام بلا سبب اخوان کے سر مقوپ دیا گیا ہے۔ اصل قصہ کچھ اور ہے۔ وہ یہ ہے کہ کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کو پہلے تو مصری قوم نے پروپیگنڈے کے طوفان میں قبول کر لیا۔ مگر جب رفتہ رفتہ اس کے اسرار کھلتے گئے اور یہودیوں کی چالبازی نمایاں ہوتی گئی تو مصری عوام کے اندر اس سمجھوتے کے خلاف فضا پیدا ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اخوان نے پہلے ہی روز اس سمجھوتے کو مسترد کر دیا تھا۔ اور پھر اخوان کی ہمنوائی میں مصر کے دینی حلقوں اور نوجوانوں کی اسلامی تنظیموں نے بھی اس پر شدید تنقید شروع کر دی۔ اور بات اس حد تک بڑھ گئی کہ مصر کی ہر مسجد و منبر سے کیمپ ڈیوڈ کے خلاف آواز بلند ہو گئی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اسرائیلی لیڈروں نے سادات کو متنبہ کر دیا کہ اگر یونہی مصر میں اخوان المسلمون اور دیگر اسلامی جماعتیں اور مذہبی حلقے اسرائیل کے خلاف عوام کو بھڑکاتے رہے تو اسرائیل ہرگز سینا کو خالی نہیں کرے گا۔ یہ گویا اسرائیل کی طرف سے سادات کو یک گونہ دھمکی تھی۔ سادات یہ دھمکی سُن کر اعصابی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ اور اس ہسٹیریائی حالت میں اس نے اخوان اور اسلامی جماعتوں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اخوان کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ " لن ارحم " (میں ان پر ہرگز نہیں رحم کھاؤں گا) اور مصر کے ایک ہر دلعزیز خطیب شیخ محمد المحلاوی کو جیل میں ڈال کر کہا کہ " میں نے ایک کتے کو جیل میں ڈال دیا ہے۔" (استغفر اللہ)

اسی پکڑ دھکڑ میں جناب عمر تلمسانی، کمال سنانیری اور دیگر زعمائے اخوان بھی گرفتار کر لیے گئے۔ حسنی مبارک سے یہ توقع تھی کہ وہ پیشرو کی غلطیوں کی اصلاح کریں گے۔ لیکن انہوں نے تا حال یہ عزم کر رکھا ہے کہ وہ سادات کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سادات کے جاری کردہ مشن کو مکمل کریں گے۔ حسنی مبارک کے دور میں ہی یہ نامبارک واقعہ پیش آیا کہ کمال سنانیری جیسا اعلیٰ پائے کا متوازن مزاج اور فرشتہ خصلت انسان جیل میں شہید کر دیا گیا۔ اس بے گناہ خون کا نتیجہ حسنی مبارک صاحب کے حق میں کیا برآمد ہو گا اس کا جواب مستقبل دے گا۔

امام حسن البناء رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ تحریک کے مثالی کارکن کے اوصاف بیان کرتے ہوئے

فرمایا تھا کہ اس میں تین خصلتوں کی جھلک ملنی چاہیے (۱) دَمعَۃُ المُتَھَجِّد (تہجد گزار کے آنسو)۔ ۲۔ تَبَاھُدُ الفقیہ (فقیہ کی ذہانت)، ۳۔ شجاعۃُ المُقَاتِل (جنگ جو کی بہادری)۔ تعلق باللہ کا سب سے بڑا ثبوت وہ بے ریا اشک ہیں جو رات کی تنہائیوں میں خدا پرست انسان کی آنکھوں سے ٹپکتے ہیں۔ دین کی صحیح خدمت فہم و شعور اور حکمت و دانش کے سرمایے کے بغیر انجام نہیں دی جاسکتی۔ راہِ حق کی دشوار گزار وادیوں اور طاغوتی طاقتوں کی بے پناہ ستم رانیوں کا سامنا تھڑدلے، کم حوصلہ اور تنگ مزاج لوگوں کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے صبر و شکیب کا وافر ذخیرہ اور ہمت و شجاعت کا اونچا معیار درکار ہے۔ انہی تینوں محاسن کو امام حسن البنّاؒ نے تین جامع کلمات کے اندر سمو دیا ہے۔ امام موصوف زندگی بھر اس طرز کے کارکن تیار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام حسن البنّاؒ خود ان تینوں صفتوں کا بہترین امتزاج تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تربیت سے جو کارکن پیدا کیے ان میں بھی ان کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جناب کمال سنانیری بھی اُن لوگوں میں سے تھے جو اپنے مُرشد کے اس معیار کے آئینہ دار تھے۔

کمال شہید کو اپنے رب سے بے پناہ محبت تھی۔ انہوں نے اپنی جان و مال اور اپنی زندگی کی ہر اُمنگ و آرزو کو بلکہ زندگی کی ہر عزیز سے عزیز تر شے کو خدا کے راستے میں بیچ دیا تھا۔ ضروریاتِ زندگی کا دائرہ انہوں نے بے حد مختصر کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا مضمون نظر آتے تھے کہ "کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل (دُنیا میں اس طرح رہو کہ گویا تم کوئی نووارد ہو یا مسافر)۔ کویت، سعودی عرب اور پاکستان میں کئی بار اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سفر میں صرف ایک یا دو پہننے کے جوڑے رکھتے تھے، اور باقی ہر ضرورت سے بے نیاز رہتے۔ یہی حال اُن کا مصر میں تھا۔ ان کے ایک رفیق مصطفےٰ مشہور بتاتے ہیں کہ قاہرہ میں کمال سنانیری کی رہائش گاہ چند برتنوں، دو تین چارپائیوں اور چند مردانہ اور زنانہ جوڑوں سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ اپنی ہر چیز تحریک کے سپرد کر چکے تھے۔ اور عیشِ کفاف کو نظریۂ حیات بنا چکے تھے۔ ان کی تمام مالی و جسمانی توانائیاں، ذہنی و فکری صلاحیتیں اور اوقات و لمحات کی فرصتیں راہ حق کے لیے وقف ہو چکی تھیں۔ اس درویشانہ زندگی اور مجاہدانہ روش اختیار کرنے میں اُن کی رفیقِ حیات بھی بڑی ممد و معاون ثابت ہوئیں (باقی بر صفحہ ۴۶)

رسائل و مسائل

مسئلۂ شہادتِ حق

سوال: تحریکِ اسلامی کی پہلی کتاب "شہادتِ حق" نظر سے گزری۔ اس نے عجیب الجھن میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں کے امیر سے میں نے (CONTACT) کیا مگر وہ مطمئن نہ کر سکے۔ انہوں نے آپ کا پتہ دیا۔ میرے سوالات درج ذیل ہیں۔

۱۔ وہ مسلمان جو کسی بھی تحریکِ اسلامی سے منسلک نہیں ہوتے۔ کیا کسی صورت میں بھی وہ شہادتِ حق کا فریضہ انجام نہیں دے رہے ہوتے؟

۲۔ وہ لوگ (مراد مسلمان) جو گورنمنٹ ملازم ہوں، ایک تنظیمی صورت میں شہادتِ حق کا فریضہ کیسے انجام دیں؟

۳۔ شعور سنبھالتے ہی کیا ایک مسلمان پر فرض عائد ہو جاتا ہے کہ وہ فوراً کسی تحریک کے ساتھ منسلک ہو کر شہادتِ حق کا فریضہ سرانجام دے؟ کیا وہ کچھ عرصے تک کے لیے یہ فریضہ سرانجام دینے سے (DELAY) نہیں کر سکتا؟

۴۔ جو مسلمان ایک تنظیمی صورت میں شہادتِ حق کا فریضہ انجام نہیں دیتے وہ تقریباً نامسلم ہوتے ہیں۔ تحریک کے مسلک کی رُو سے، یہ کیوں؟

۵۔ اُمتِ محمدیہ (اکثریت) نے اس اہم فریضہ سے کنی کیوں کترائی؟ اور اب بھی یہی حال ہے۔

۶۔ سابقہ بڑے بڑے علماء، ائمہ اور مجددین تھے، ایک تنظیمی صورت میں اس اہم فریضہ کو کیوں نہ انجام نہ دیا؟

۷۔۔۔ مغرب کے لوگ اپنی اس عادت کی بہت تشہیر کرتے ہیں، اور فخر بھی کہ ہم منظم (مراد ٹائم ٹیبل بنا کر) زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہم مشرق کے رہنے والے غریب لوگ جن کا آنے والا ہر دن ایک ہنگامی دن ہوتا ہے، معاش کے بکھیڑے ہی ایسے ہوتے ہیں کہ بنیادی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ میرا اتنا کچھ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر اسلام ایسا کچھ کرنے کی تلقین کرتا ہے تو چار و ناچار ہم منظم زندگی گذاریں گے۔ بصورت دیگر ہمیں کیا پڑی ہے کہ مغرب کی تقلید کریں۔

جواب:۔

آپ نے جس کھلے دل سے اور صاف صاف انداز سے اپنے اشکال (متعلق "شہادتِ حق") لکھے ہیں اُن سے میرے اندر آپ کے بارے میں یہ حُسنِ ظن پیدا ہوا ہے کہ آپ کا مقصد گریز اور فرار نہیں بلکہ آپ صحیح بات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اسی بنا پر میں نے مفصل جواب لکھنے کا اِرادہ کیا۔ اگر میری گذارشات گرہ کشائی میں معاون ہو سکیں تو بہت اچھا، ورنہ کم سے کم آپ از سرِ نو سوچیں گے تو سہی!

جن رفیق (مقامی امیر) نے آپ کو میرا حوالہ دیا ہے، مَیں اُن کی محبت کا بھی شکرگذار ہوں اور آپ نے جس اعتماد سے مجھے مخاطب کیا ہے اُس پر بھی پورا اترنے کی خواہش کرتا ہوں۔ میری معروضات مفید ہوں تو اللہ کا شکر، غیر مؤثر ہوں تو میری کوتاہی!

پمفلٹ "شہادتِ حق" ہو یا جماعت اسلامی کا بقیہ لٹریچر، نیز تمام بزرگوں اور موجودہ علماء کے رسائل اور کتب یا دینی اداروں کی دعوتی سرگرمیاں، اُن سب کی اصل قدر و قیمت اس پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ ہمیں کتاب و سنّت کے تقاضوں سے روشناس کرائیں۔ قرآن کے بتائے ہوئے عقائد و احکام ہوں، یا سنت کے واضح کردہ حِکَم و معارف، اس دولتِ دین کا کوئی حصّہ کہیں سے بھی ملے، بلا تعصّب اسے اخذ کر لینا چاہیے۔ لیکن جس تحریر و تقریر کا سررشتہ معنی کتاب و سنّت سے نہ ملتا ہو، یا بیچ بیچ میں کبھی ملے اور کبھی ٹوٹ جائے۔ اس کے بارے میں احتیاط واجب ہے۔

اصل سوال جو شہادتِ حق کو پڑھ کر کسی کے دل میں پیدا ہونا چاہیے وہ یہی ہے کہ اس معاملے میں خدا اور رسولؐ کی رہنمائی کیا ہے؟ پھر اگر کوئی بات خدا اور رسولؐ کے منشا کے مطابق سامنے آجائے تو دوسرا سوال صرف یہی کوئی شخص سوچ سکتا ہے کہ ایسی بات پر عمل پیرا کیسے ہوا جائے اور مشکلات اور رکاوٹیں کیسے

دُور کی جائیں۔ مگر آپ کا ذہن اصل سوال سے ہٹ کر دوسرے اطراف میں نکل گیا ہے۔

جس اصل سوال کا میں ذکر کر رہا ہوں، اُس کے جواب میں شہادتِ حق میں خاصے اہم دلائل و شواہد موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک بار آپ اِن پر بہ طورِ خاص توجہ کریں۔ وہ یہ ہیں:

۱۔ "مسلمان کے نام سے آپ کو ایک مستقل اُمت بنانے کی واحد غرض جو قرآن میں بیان کی گئی ہے، وہ یہی ہے کہ آپ تمام بندگانِ خدا پر شہادتِ حق کی حجت پوری کریں"۔

(شہادتِ حق ص ۵)

اس دعوے کے سامنے یہ آیت پیش کی گئی ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ۔ ۱۴۳)۔

علاوہ ازیں مزید دو آیات بھی سامنے رکھی ہیں:

اوّل ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (المائدہ ۔ ۸)

دوم ۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ (البقرہ ۔ ۱۴۰)

۲۔ "اسی شہادت کے لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اور اس کا ادا کرنا ان پر فرض تھا ۔ اور اب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ فرض اُمتِ مسلمہ پر بہ حیثیت مجموعی اسی طرح عاید ہوتا ہے، جس طرح حضورؐ پر آپ کی زندگی میں شخصی حیثیت سے عاید تھا"۔ (شہادتِ حق ص ۷)

اب میں یہاں مزید وضاحت کے لیے اپنی طرف سے یہ کہتا ہوں کہ اسلام میں کلمۂ شہادت کا وجود ہی خود متذکرہ فریضے پہ دلالت کر رہا ہے۔ ایک عامی سے عامی مسلمان بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ اس کی زبان سے اگر کہلوایا جا رہا ہے کہ "میں گواہی دیتا ہوں ...." تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدائے واحد کی الوہیت اور جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی حقانیت کا گواہ بن کے اٹھا ہے۔ ہماری تمام مساجد سے پنج وقتہ یہ گواہی نشر ہوتی ہے۔ گویا فریضۂ شہادت کوئی اہم چیز ہے۔ جس کے لیے بڑے بنیادی اہتمام کیا گیا ہے۔ دین میں اگر گواہی اور اعلان کی ضرورت نہ ہوتی تو انبیاء اور صلحا اپنے اپنے دور میں ذاتی حد تک ایمان لا کر اُسے دل ہی دل میں رکھتے اور زندگی کے ہنگامے میں کوئی مداخلت نہ فرماتے اور نہ وقت کے کفار و مشرکین اور ان کے سرداروں کے لیے پریشانی کا باعث بنتے جب کوئی پیغمبر اٹھتا ہے اور

جہاں پر اللہ کا کوئی بندہ خدا کے دین کا خادم بنتا ہے، وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا تک ایک پیغام پہنچاتا ہے۔ ایک گواہی دیتا ہے، ایک اعلان کرتا ہے اور پیغام کو قبول کرنے والوں کو اپنے گرد جمع کر کے ان کو بھی اسی گواہی دینے کے عمل کی تربیت دیتا ہے، جس کے نتیجے میں خدا کے نقیبوں کی گواہی قبول کرنے والے بھی گواہی دینے لگتے ہیں۔

ویسے ہر شخص اپنے قول و فعل سے کسی نہ کسی نظریے یا مسلک کی شہادت دے رہا ہوتا ہے۔ بعض کی شہادت مثبت اور اقدامی انداز کی ہوتی ہے، بعض کی جامد۔ یا بعض لوگوں کے ہاں دوہری دوہری شہادتیں پائی جاتی ہیں۔

اب میں آپ کے سوالوں کے جواب لکھتا ہوں، کئی ضروری امور ان میں آ جائیں گے۔

۱۔ تحریک یا جماعت کی اہمیت کی بات آگے آ رہی ہے۔ یہاں میں سوال کے جواب میں اتنا ہی کہوں گا کہ مختلف قسم کے مسلمانوں کے مختلف حالات ہوتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ کم سے کم انفرادی حد تک جزوی طور پر شہادت دے رہے ہوتے ہیں۔ بعض کی قولی اور عملی شہادت میں فرق ہوتا ہے۔ بعض ایسے بھی ہیں جو مسلمان پیدا ہونے کے باوجود کسی مخالفِ اسلام نظریہ و مسلک کی شہادت دیتے اور اس کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے طرزِ عمل کا جوابدہ ہے۔

۲۔ ملازمین کا مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں۔ اس طبقے کے افراد بھی مختلف دینی تحریکوں اور سرگرمیوں میں ہمیشہ حصہ لیتے رہے ہیں اور آج بھی دین کی خدمت کے دروازے ان پر بند نہیں ہیں۔ اگر ملازمت کا ضابطہ صفِ اوّل میں کام کرنے سے مانع ہو تو پیچھے رہ کر کام کر سکتے ہیں۔ اور خود دفتری دائرے میں اگر یہ دینِ اسلام کے حق ہونے کی شہادت دینا چاہیں تو ایسے حلقے بنا سکتے ہیں جو ایک طرف عقائد و عبادات کی تلقین کرنے والے ہوں، دوسری طرف اپنے ساتھیوں میں فرض شناسی اور دیانت داری کا وہ اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کریں جس کو دیکھ کر ہر کوئی یہ محسوس کرے کہ ان لوگوں کو اسلام نے فوز و سعادت سے نوازا ہے۔ پھر گھروں کا دائرہ ہے، دوست احباب اور رشتہ داروں کے دائرے ہیں۔ ان دائروں میں شہادتِ حق دینے پر تو کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔

۳۔ اس سوال کو آپ ذرا محدود کر لیں۔ یعنی یوں سوچیں کہ کیا شعور آتے ہی ایک مسلمان کو نماز روزہ کی پابندی اختیار کرنی چاہیے۔ یا یہ کہ کیا وہ دائرۂ ایمان میں داخل ہوتے ہی قمار، زنا اور

شراب سے تعلق توڑ لے یا یہ کہ وہ راستی، دیانت اور انصاف کا راستہ اختیار کر لے۔ جس طرح ان معاملات میں وہ اپنے آپ کو نئی روشِ زندگی کا پابند کرے گا۔ اسی طرح شہادتِ حق دینے کی ذمہ داری پوری کرنے میں بھی سرگرم ہوگا۔

اگر آپ سیرتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور احوال صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ جس نے بھی حضورؐ کی دعوت قبول کی، اُس کے لیے چپ رہنا آپ کو اس دعوت کے پھیلانے سے روکے رکھنا ممکن نہ رہا۔ حضرت ابوذرؓ کی مثال سامنے ہے کہ ایمان لاتے ہی کعبہ میں جا کر اعلان کیا اور مار کھائی۔ حضرت سیدنا عمرؓ نے اسلام قبول کیا تو زوردار اور مؤثر طریقوں سے یہ گواہی عام کر دی کہ میں خدا اور رسولؐ پر ایمان لے آیا ہوں۔ وہاں ہر شخص پیغام قبول کرتے ہی جان لیتا تھا کہ یہ پیغام مجھے آگے پہنچانا ہے۔ مگر ہمارے ہاں یہ حال ہے کہ آپ پوچھتے ہیں کہ مسلمان ہونے کا شعور ہوتے ہی کیا بلا توقف شہادتِ حق دینا ضروری ہے؟ اس میں پوچھنے کی کوئی بات ہی نہیں۔ آپ نے اگر چشمِ بینا اور دلِ روشن کے ساتھ یہ حقیقت پائی کہ رات کی تاریکی سے دن کی روشنی اچھی ہے تو پھر اس حقیقت کو دوسروں تک پہنچانے میں مہلت تلاش کرنے کی کیا ضرورت؟ آپ کو اللہ نے جس لمحے یہ شعور عطا کر دیا کہ خدا اور رسولؐ کا دین ہی مبنی بر صداقت اور ذریعۂ فلاح ہے تو مجھے اسی حقیقت کو آگے منتقل کرنے میں تامّل کیوں؟ تاخیر کی ضرورت کیا؟

دراصل یہ ساری اُلجھن اُن مسلمانوں کو کبھی پیش نہ آئی جو کفر و شرک کو چھوڑ کر ایمان لائے۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم پہلے سے مسلمان ہیں اور ہمیں اسلام کی ذمہ داریوں کے بارے میں یہ مسئلہ پیش آتا ہے کہ آیا ہم ان کو شعور پاتے ہی پورا کرنے لگیں یا کچھ مہلت گزار کر۔

۴ — ہمارا مسلک کبھی یہ نہیں رہا کہ مسلمانوں کو نامسلم قرار دیں یا اُن کی تکفیر کریں۔ ہمارا اندازِ تلقین ہمیشہ یہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو یہ جاننا چاہیے کہ اُن پر یہ اور یہ ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں، انہیں پورا کرنے ہی سے مسلمان ہونے کا حق ادا ہوگا۔

مثلاً ایک سادہ سی مثال لیجیے۔ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نماز نہیں ادا کرتی، حالانکہ نماز کی اہمیت دین میں بہت زیادہ ہے۔ ایمانیات کے بعد فرض عبادات میں نماز سرِ فہرست ہے۔ مگر ہمارا طریقِ نصیحت یہ کبھی نہیں رہا کہ جو نماز نہ پڑھتا ہو اُس کی پہلے تکفیر کریں اور پھر اُس سے کہیں کہ مسلمان ہونا یا

رہنا چاہتے ہو تو نماز ادا کرو۔ داعی اور معتقم فرد یا جماعت کا کام تکفیر ہے ہی نہیں، اس کا تو طریقہ یہ ہوگا کہ لوگ جس جگہ ہیں، وہاں سے وہ آگے قدم بڑھائیں۔ میں اس سلسلے میں چند الفاظ "شہادتِ حق" ہی سے نقل کرتا ہوں:۔ پہلی بات تو یہ کہ اُن مسلمانوں کو مسلمان قرار دے کر ہی بات کی گئی ہے جو پہلے سے مسلمان ہیں:۔

"ہماری دعوت کا خطاب ایک تو اُن لوگوں سے ہے جو پہلے سے مسلمان ہیں، دوسرے اُن عام بندگانِ خدا سے جو مسلمان نہیں ہیں"[۱] (شہادتِ حق۔ ص ۴)

پھر کہا گیا ہے کہ:۔

"مسلمانوں کو ہم جس چیز کی طرف بلاتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ اُن ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ادا کریں جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اُن پر عاید ہوتی ہیں"۔

(شہادتِ حق۔ ص ۵)

پھر خاص طور پر شہادتِ حق کو بہ حیثیت ایک ذمہ داری کے پیش کیا گیا ہے:

"وہ ذمہ داریاں کیا ہیں؟ وہ صرف یہی نہیں کہ آپ خدا پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر، اُس کے رسولوں پر اور یومِ آخرت پر ایمان لائیں۔ وہ صرف اتنی بھی نہیں ہیں کہ آپ نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، حج کریں اور زکوٰۃ دیں۔ وہ صرف اتنی بھی نہیں ہیں کہ آپ نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ معاملات میں اسلام کے مقرر کیے ہوئے ضابطے پر عمل کریں، بلکہ اُن سب کے علاوہ ایک بڑی اور بہت بڑی ذمہ داری آپ پر یہ بھی عاید ہوتی ہے کہ آپ عام دُنیا کے سامنے اُس حق کے گواہ بن کے کھڑے ہوں، جس پر آپ ایمان لائے ہیں"۔ (شہادتِ حق۔ ص ۵)

ذمہ داریوں کا تو معاملہ ہی یہی ہے کہ جب اُن کا علم اور شعور ہو، اسی وقت سے انسانی ضمیر اس کا پابند ہو جاتا ہے کہ وہ انہیں ادا کرے یا انہیں ادا کرنے کی کوشش کرے یا ادا کرنے کا علم اور اس

---

[۱] واضح رہے کہ یہ ۱۹۴۷ء کی تقریر ہے اور اس میں جن دوسرے لوگوں کا ذکر ہے اُن سے مراد ہندو، سکھ آبادی تھی۔

کے ذرائع حاصل کرنے میں لگ جاتے۔ غفلت اور نادانی جب تک رہے تو آدمی کا ایک عذر ہوتا ہے، لیکن علم و شعور ہونے کے بعد عذر ختم ہو جاتا ہے اور حجت قائم ہو جاتی ہے۔

۵ — امتِ محمدیہ نے قرونِ اولیٰ میں شہادتِ حق کی ذمہ داری بڑے معیاری طریقے سے انجام دی ہے۔ پھر اس کے بعد کے دور میں بھی ایسے علمائے حق اور ائمہ ہدیٰ اٹھتے رہے۔ جنہوں نے نہ صرف خود اس ذمہ داری کا حق ادا کیا، بلکہ دوسروں کو بھی ادائے فرض میں لگایا۔

لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہمارے سامنے ہے کہ ہماری خاصی بڑی اکثریت اس ذمہ داری کو فراموش کر بیٹھی۔ آپ سوال کرتے ہیں کہ لوگ کنی کیوں کتراتے ہیں، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ لوگ نماز جیسے بنیادی فریضہ کو ادا کیوں نہیں کرتے؟ جو جواب اس سوال کا ہو سکتا ہے، وہی آپ کے سوال کا بھی ہے۔ میں ان دونوں سوالوں کے جواب میں یہ کہتا ہوں کہ زوال و انحطاط کا ایک عمل ہے جس سے ہم دوچار ہیں یہاں موقع نہیں کہ وجوہِ زوال انحطاط پر بحث کی جائے۔

جب کسی دینی ملت پر زوال طاری ہو گیا ہو تو اس کا علاج صرف اس طریقے سے ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو دعوت دے کر اور تلقین کر کے ان کے ایمان اور علم اور شعور کو تازہ کیا جائے اور انہیں غفلت اور جمود کے گرداب سے نکالا جائے۔ جوں جوں لوگوں میں ایمان بیدار ہو گا، علم پھیلے گا اور شعور ابھرے گا، انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہونے لگے گا۔ کم سے کم سلیم الطبع عناصر سے تو یہی امید کرنی چاہیے۔

ٹھیک یہی طریقہ ہے جو جماعت نے توسیعِ دعوت اور فروغِ علمِ دینی کے لیے اختیار کیا، اور اسی کے مطابق مولینا مودودیؒ نے وہ تقریر کی تھی جسے آپ نے آج شہادتِ حق کے نام سے ملاحظہ فرمایا ہے۔ یہ سراسر ایک یاددہانی اور چیتاؤنی ہے۔ بے شمار لوگوں نے مولینائے مغفور کی یاددہانی سے استفادہ کر کے اپنی زندگیوں کا نقشہ بدلا ہے اور آئندہ بھی لوگ اپنے افکار و کردار کی تعمیرِ نو کرتے رہیں گے۔

۶ — تمام سابقہ علمائے حق نے کسی نہ کسی طریق سے شہادتِ حق کا فریضہ ادا کیا ہے۔ اور ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جن کے دور میں جماعت بندی ممکن نہ تھی۔ پھر بھی بعض نے حلقہ ہائے شاگرداں، بعض نے حلقہ ہائے ارادت و بیعت کی صورت میں جماعت کی ضرورت کو پورا کرنے کی

کوشش کی۔

برائے تحقیقات تو سابق ادوار کی دینی شخصیتوں کے کام کی کھوج کرید کرنی چاہیے اور اُن سے مفید اسباق لینے چاہئیں، مگر دین کے مطالبات کو جاننے کے بعد اُن پر عمل کرنے کے لیے یہ شرط عاید نہیں کی نہیں جا سکتی کہ پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ سلف کے تمام کے تمام اصحاب نے یا خاص طور پر فلاں فلاں اصحاب نے اُن مطالبات کو پورا کیا یا نہیں اور پورا کیا تو کس حد تک۔ دین میں دلیل و سند خدا کے بعد انسانوں میں سے صرف رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے۔ جو سوال پوچھنا ہو، وہاں سے پوچھیے اور جو نمونہ لینا ہو، وہاں سے لیجیے۔ ہاں جس جس ہستی کے جو بھی اقوال و اعمال اسوۂ حضورؐ کے مطابق ہوں گے اُن سب کو قابلِ قدر بھی سمجھنا چاہیے اور اُن سے فائدہ بھی اٹھانا چاہیے۔

۷ — اس سوال کا نمبر نہیں ہے، مگر یہ بھی ایک ضروری سوال ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ مغرب کے لوگ بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ ہم منظم زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اصلاً تو مغرب سے پہلے ہم منظم اور جماعتی زندگی کا ایک اعلیٰ معیار لے کے چلے تھے، کیونکہ اجتماعیت ہمارے دین کا مزاج ہے اور جماعت کی اہمیت اصولی ہے۔ قرآن میں آپ "اُمت" اور "ملت" اور "حزب اللہ" اور "شوریٰ" کے الفاظ کو اور حدیث میں لفظ "جماعت" کو دیکھیں گے کہ یہ ساری اصطلاحیں اجتماعیت کی آئینہ دار ہیں۔ پھر عبادات کا نظام اجتماعی ہے۔ حج کے لیے امیرِ حج، قافلے کے لیے امیرِ سفر اور دو افراد بھی اگر نماز پڑھیں تو ایک امامِ صلوٰۃ ہوتا ہے۔ گھروں کے نظام کو درست رکھنے کے لیے خاتونِ خانہ کو "راعیۃ علی بیت زوجہا" کہا گیا ہے، یعنی وہ اپنے شوہر کے گھر کی کارپرداز ہوتی ہے۔ مرد کو قوامیت کا منصب دیا گیا ہے۔ غرضیکہ کوئی بھی شعبۂ زندگی اور گوشۂ تمدن ایسا نہیں ہے، جہاں مسلمان جماعت کے بغیر زندگی گذار سکے۔

ایک اسکول چلانے کے لیے، ایک دفتر چلانے کے لیے، ایک دارالاشاعت چلانے کے لیے اور ایک عام کاروبار چلانے کے لیے منظم ادارات کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخر آپ نے یہ کیسے خیال کر لیا کہ دعوتِ دین، شہادتِ حق، اور توسیعِ اصلاح اور اقامتِ دین کے لیے جو لوگ اُٹھیں وہ بکھرے ہوئے افراد ہوں۔ حالانکہ کام جتنا زیادہ اہم اور جتنا بڑا ہے اس کے لیے اتنی

ہی زیادہ ضرورت اجتماعی مساعی کی ہے ۔ بہت سے افراد جب اپنی دماغی ، مالی اور جسمانی صلاحیتوں کو ایک نظم میں لے آتے ہیں تو وہ بڑے پیمانے پر کام کو کر سکتے ہیں ۔ ایک تنہا فرد اگر اپنے بل بوتے پر ایک پمفلٹ چھپوا سکتا ہے تو سو پچاس آدمی مل کر پورا ایک پریس قائم کر سکتے ہیں ۔ ایک شخص اگر دو چار نسخے کسی کتاب کے پھیلاتا ہے تو ایک جماعت ، کئی لائبریریاں قائم کر سکتی ہے ۔

جماعت کی ضرورت صرف اس لیے نہیں کہ کام کا پیمانہ بڑھ جاتا ہے بلکہ اس لیے بھی ہے کہ جماعت کے سہارے ایک فرد مشکل حالات میں کھڑا رہتا ہے ۔ اُسے اپنے ساتھیوں سے حوصلہ ملتا ہے ۔ پھر جماعتی نظم میں چلنے والوں کی تربیت ہوتی رہتی ہے ۔ ایک دوسرے کو وصیت کرنے سے اور ایک دوسرے کا احتساب کرنے سے افراد اپنے ایمان و کردار میں مضبوط رہتے ہیں ۔

مگر سوال محض فوائد اور مصلحتوں کا نہیں ہے ، دین خود جماعتی نظم کا مطالبہ کرتا ہے ، اور بغیر نظم کے شہادتِ حق کا فریضہ کما حقہٗ ادا نہیں ہو سکتا ۔ اس سلسلے میں پیشِ نظر پمفلٹ میں یہ رہنمائی موجود ہے ۔

> " اسلام کے سب تقاضے انفرادی طور پر پورے نہیں کیے جا سکتے ، اس کے لیے اجتماعی سعی ضروری ہے " ---------- یہی وجہ ہے کہ دین میں جماعت کو لازم قرار دیا گیا ہے ---------- اور یہی وجہ ہے کہ جماعت کے بغیر زندگی کو جاہلیت کی زندگی ، اور جماعت سے علیحدہ ہو کر رہنے کو اسلام سے علیحدگی کا ہم معنی قرار دیا گیا ہے " ۔
>
> (شہادتِ حق ۔ ص ۲۶)

نوٹ :۔ اس مقام پر حاشیے میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے ، جس کا آغاز اَنَا اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ کے الفاظ سے ہوتا ہے ۔ اس میں جماعت اور سمع و طاعت کو لازم گردانا گیا ہے اور اوپر کے اقتباس میں جو تین باتیں شامل ہیں ، اس حدیث سے اُن کی توثیق ہوتی ہے ۔

آپ نے یہ عجیب بات لکھی ہے کہ " ہم مشرق کے رہنے والے غریب لوگ ، جن پر آنے والا ہر دن ایک ہنگامی دن ہوتا ہے ، معاش کے بکھیڑے میں ایسے ہوتے ہیں کہ بنیادی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں ---------- الخ اور اس سے آگے یہ محذوف ہے کہ ہمارے لیے جماعتی منظم زندگی اختیار کرنا ممکن نہیں ۔ بے شمار لوگ ہمارے اردگرد غریب ہوتے ہوئے لڑائیاں ، جھگڑے ، مقدمہ بازیاں

تفریحیں، سینما بینی، آوارہ گردی، اور طرح طرح کی تقریبیں کرتے رہتے ہیں۔ تاش چوسر کھیلتے ہیں — دوستوں میں گپ لڑاتے ہیں، ہوٹلوں یا چائے خانوں میں پہنچتے ہیں۔ بس لے دے کے زندگی میں اجتماعیت پیدا نہیں کر سکتے۔ آپ کے دلائل کی بنیاد پر تو ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ میں چونکہ غریب آدمی ہوں، اس لیے نماز نہیں پڑھ سکتا، روزہ نہیں رکھ سکتا، کوئی نیک کام نہیں کر سکتا، حجامت نہیں کرا سکتا، کپڑے نہیں دھو سکتا، بستر نہیں بچھا سکتا، اخبار نہیں پڑھ سکتا، ریڈیو نہیں سن سکتا، غرضیکہ زندگی کی ہر ضرورت و مصروفیت کے متعلق یہ عذر کیا جا سکتا ہے۔ مگر عملاً ہونے والے کام ہوتے رہتے ہیں، آدمی کلاس روم میں بھی ایک اجتماعیت سے وابستہ ہوتا ہے، دفتر میں بھی وہ ایک نظم سے رہتا ہے۔ گھر بھی ایک اجتماعی ادارہ ہے۔ لے دے کے بس دین کی خدمت کے لیے اجتماعی صورت اختیار نہیں کی جا سکتی۔

میں آپ کی اطلاع کے لیے عرض کردوں کہ ہم لوگ جو شہادتِ حق کا منظم کام کر رہے ہیں، ہماری بیشتر تعداد غریب لوگوں پر مشتمل ہے جن کو سخت قسم کی معاشی جد و جہد سے سابقہ ہے۔ بہت سی دوسری تنظیموں اور اداروں سے بھی غریبوں کی ایک تعداد وابستہ ہے۔ معلوم نہیں کہ آپ نے غریبی کا مسئلہ بیچ میں کیوں چھیڑا، اور پھر مشرق کی نسبت سے بھی عذر پیش کیا کہ ہم مشرق کے لوگ نظم کے قریب نہیں پھٹک سکتے۔

رہا ٹائم ٹیبل یا تنظیمِ اوقات کا مسئلہ تو اُس کی ضرورت کافر سے زیادہ مسلمان کو، اور امیر سے زیادہ غریب کو ہے۔ صرف اسی طرح ایک ایک لمحے سے پورا استفادہ کرنا ممکن ہے۔ تنظیمِ اوقات کی تعلیم بھی اسلام نے دی ہے۔ لہٰذا چار و نا چار یہ کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ آپ کے باقی خط سے تو نہیں، البتہ اس حصے کو پڑھ کر فراری کا رجحان جھلکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ محض میری غلط فہمی ہو۔

آخر میں میں اِس طرف بھی توجہ دلا دوں کہ "شہادتِ حق" کے مؤلف مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے یہ بات وضاحت سے کہہ دی ہے کہ ہم خاص اپنی ہی جماعت کی طرف دعوت نہیں دے رہے، ملاحظہ ہو:-

"اب تمہارے سامنے تین راستے ہیں، اور تمہیں پوری آزادی ہے کہ ان میں جس کو چاہو اختیار کرو۔ اگر تمہارا دل گواہی دے کہ ہماری دعوت، عقیدہ، نصب العین، نظامِ جماعت اور طریقِ کار سب کچھ خالص اسلامی ہے اور ہم وہی کام کرنے اُٹھے ہیں

جو قرآن و حدیث کی رُو سے اُمتِ مسلمہ کا اصل کام ہے تو ہمارے ساتھ آجاؤ۔ اگر تمہیں کسی وجہ سے ہم پر اطمینان نہ ہو اور کوئی دوسری جماعت تم کو ایسی نظر آتی ہو جو خالص اسلامی نصب العین کے لیے اسلامی طریق پر کام کر رہی ہو تو اُس میں شامل ہو جاؤ ——

اور اگر تم کو نہ ہم پر اطمینان ہے اور نہ کسی دوسری جماعت پر تو پھر تمہیں اپنے فرضِ اسلامی کو ادا کرنے کے لیے خود اُٹھنا چاہیے اور اسلامی طریق پر ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جس کا مقصد پورے دین کو قائم کرنا اور قول و عمل سے اُس کی شہادت دینا ہو.....

ہم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ صرف ہماری ہی جماعت حق پر ہے۔ اور جو ہماری جماعت میں نہیں ہے وہ باطل پر ہے۔" (شہادتِ حق۔ ص ۲۷-۲۸)

خدا کرے کہ آپ میرے ان معروضات پر صاف دل سے غور کریں۔ پھر اگر یہ کوشش آپ کی کسی گرہ کو سلجھانے میں مدد ہو، تو آپ بھی خدا کا شکر ادا کریں اور میں بھی۔ ورنہ آپ کی ذمہ داری آپ تک اور میری ذمہ داری مجھ تک۔

مطبوعات

تفسیر آیتِ کریمہ رشحاتِ قلم شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ - عربی سے ترجمہ از الاستاذ عبدالرحیم پشاوری
ناشر مکتبہ نذیریہ - پتہ : منیر شہید روڈ - بالمقابل جاوید مارکیٹ، اچھرہ، لاہور۔ صفحات: ۲۰۴، کاغذ سفید۔ قیمت -/۱۸ روپے۔ محصول ڈاک بذمہ مکتبہ۔

حضرت امام ابن تیمیہ جنہوں نے قلم اور تلوار دونوں سے جہاد کیا، کبھی درباروں میں صدائے حق بلند کی اور کبھی زندانوں کی تاریکیوں کو ایمان و عرفان کے نور سے بھر دیا، کبھی اپنوں کا احتساب کیا اور کبھی غیروں کو لاجواب کیا، جنہوں نے وقت کے ہر فتنے کے مقابلے کے لیے علوم کے قلعے کے قلعے کھڑے کر دیے اور ان قلعوں سے کبھی مثبت استدلال اور کبھی مناظرانہ بحثوں کے وہ گولے برسائے کہ طاغوتی عساکر تہس نہس ہو کر رہ گئے - اس مجدّدِ وقت نے قرآنی صداقتوں اور نبوی حکمتوں کے متعلق ایسے ایسے رسائل لکھے جن میں ایک ایک محدود سے موضوع کے تحت دینی حقائق کے انبار جمع کر دیے -

ایسا ہی یہ ایک رسالہ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں آیت کریمہ (لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ) کی تفسیر بیان کی گئی ہے - مگر بات چھڑی تو پھر شاخ در شاخ اس سے ضیاپاش مسائل و مباحث پھوٹتے چلے گئے - واعظانہ اور مناظرانہ انداز سے نہیں، بلکہ عالمانہ اور محققانہ انداز سے -

امام ابن تیمیہ توحید کے عظیم پرچم بردار ہیں - ان کی ساری تحریروں کے رگ و پے میں توحید سرایت کیے ہوئے ہے - پیشِ نظر کتاب میں تیسرا اور چوتھا باب، اُن کے اعتقادِ توحید کو عملی سطح پر نمایاں کرتے ہیں - توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت کا فرق بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ "توحیدِ ربوبیت کا تو عرب کے مشرکوں کو بھی اقرار تھا" (ص ۷۶) "خدا کی توحیدِ الوہیت کے معترف نہیں تھے" (ص ۷۸)

سورہ بقرہ کی آیت ۱۶۵ سے استدلال کیا ہے کہ "جو شخص کسی مخلوق کے ساتھ ویسی ہی محبت رکھتا ہے جو اس کو خدا تعالیٰ کے ساتھ رکھنی چاہیے تو وہ مشرک ہے۔" (ص ۸) توحیدِ الوہیت کے قائل کے متعلق فرمایا کہ اس کی "محبت اور عبادت کا منتہیٰ اور مقصود اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا بالاستقلال اس کا محبوب نہیں ہوتا۔" نیز "وہ جانتا ہے کہ مامورات کا بجا لانا اور محظورات کا ترک کرنا خدا تعالیٰ کو پسند ہے اس لیے وہ ایسا ہی کرتا ہے۔" (ص ۹) آخری نتیجہ یہ نکالا ہے کہ "دین کا ملخص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کی جائے اور بس۔" (ص ۸۴)۔

معمولی درجے کے خواندہ طبقے کے فہم سے یہ کتاب قدرے بلند ہے، کیونکہ اس کی بحثیں علمی ہیں۔

احیائے اسلام اور معلم — از جناب خرم جاہ مراد، ڈائریکٹر جنرل اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر (انگلینڈ)

ناشر: ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیمِ اساتذۂ پاکستان — ۸-اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور۔ خوبصورت طباعت و رنگین ٹائیٹل۔ صفحات ۴۸ — قیمت ۵۰/۴ روپے

خرم جاہ مراد تحریکی تصورِ اسلام کے علمبردار ایک دانشور محقق ہیں۔ اور ایک ممتاز ادارے کے سربراہ۔ تنظیم اساتذہ پاکستان کی سندھ تعلیمی کانفرنس (منعقدہ ۲۸ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۷۹ء) میں انہوں نے دو مختصر تقریریں کیں۔ جو اس پمفلٹ میں جمع کی گئی ہیں۔

خرم جاہ مراد نے یہ صورتِ حالات واضح کر کے کہ "اسلام کے لیے جو جدوجہد اور کشمکش برپا ہے وہ زندگی کے ہر دائرے میں حاوی ہے"، اساتذہ کو توجہ دلائی کہ "سارے میدانوں میں سب سے زیادہ اہم تعلیم ہی کا میدان ہے۔" اور "اس جدوجہد میں سب سے زیادہ اہم مقام ایک استاد کا مقام ہے۔" نیز تعلیم کے مقصد کو یوں متعین کیا کہ وہ ہمارے مقاصد و تصورات اور روایات و تہذیب کی حفاظت کرے۔ ایک جگہ مراد صاحب کہتے ہیں کہ "میں سیاسی عمل کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتا" مگر "اس نوجوان کے ذہن اور روح کے میدانِ جنگ کوئی کم اہم نہیں ہیں۔ جو آپ کے پاس تعلیم کے لیے آتا ہے۔" (ص ۳۴، ۳۵) - یہی نقطۂ نظر ہے جس پر دونوں تقریروں کی بنا استوار ہے۔

ص ۳۵، ۳۶ پر اسلامی نظامِ تعلیم کی جو چھ اہم خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ وہ بڑی اہم ہیں۔

سید بادشاہ کا قافلہ | از جناب آبادشاہ پوری - ناشر: البدر پبلیکیشنز، اردو بازار - لاہور

صفحات: ۴۵۶ - خوبصورت جلد کے ساتھ قیمت: ۴۸/- روپے -

تحریک مجاہدین ہم مسلمانوں کی برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم اور روشن باب تھا جسے انگریزی حکومت نے درسی کتابوں ہی سے نہیں، تاریخی تحقیق کے دائرے سے بھی خارج کر دیا - یعنی ہماری حیاتِ قومی کا ایک دَور غائب کر دکھایا - عدالتی اور دیگر سرکاری دستاویزوں میں اس کے جو اجزا مدفون پڑے رہے وہ بھی بڑی مسخ شدہ شکل میں تھے - مگر بلحاظ حقیقت یہ باب ایسا تھا کہ ع ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جاست

یہ ایک کوشش تھی، نظامِ کفر کے خلاف، اعلائے نظامِ حق کے لیے - یہ برصغیر میں پہلی مکمل اسلامی انقلابی اور جہادی تحریک تھی - اس تحریک کو کتابی تاریخوں سے غائب کر دینے کے باوجود اس کے اثرات بعد کی تمام دینی جماعتوں اور سیاسی تحریکوں پر پڑے -

خدا کا شکر ہے کہ مولینا مسعود عالم ندویؒ، مولانا ابوالحسن ندوی اور مولینا غلام رسول مہر نے اس دفینۂ حقائق کو فراموشی کے ملبے سے برآمد کیا، اور پھر اس موضوع پر کاوشیں ہونے لگیں -

آبادشاہ پوری صاحب کا ذہن ہمیشہ بڑے اہم موضوعات کو تلاش کرتا ہے - اور پھر ان کا قلم واقعات و حوادث کو نکھار کر اور "رجالِ داستان" کو نکھار کر پیش کرتا ہے - سید بادشاہ کا قافلہ سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد کی روئیداد ہے - اور اس کا دائرہ مشہدِ بالاکوٹ سے صادق پور، انڈیمان اور چمرکنڈ تک پھیلا ہوا ہے - آباد صاحب نے تاریخ نگاری کا ایک نیا اسلوب نکالا ہے - وہ واقعات کے پورے استحفاظ کے ساتھ افسانوی فضا پیدا کر دیتے ہیں - یہ اسلوب مطالعہ تاریخ کو دلچسپ اور سہل بنا دیتا ہے -

ایک طرف اس داستان کے "ہیروؤں" کی مقدس شخصیتیں سامنے آتی ہیں جو اپنے ایمانِ محکم، جذبہ بےتاب اور ذوقِ سرفروشی کے لحاظ سے ہمارے لیے سرمایۂ فخر ہیں - دوسری طرف وہ "ولن" اسٹیج پر آتے ہیں جو مسلمانوں میں سے ہوتے ہوئے غداری، نفاق، افتراپردازی اور تفرقہ جیسی حماقتوں سے شرمسار کرتے ہیں - اس "ولن" قوت نے تحریکِ جہاد کو اگر تباہ نہ کر دیا ہوتا تو آج بہت بڑا پاکستان موجود ہوتا اور اس میں اسلامی نظام اپنی پوری برکات کے ساتھ جلوہ گر ہوتا -

کتاب پڑھ کر تاثر ہوتا ہے کہ سید بادشاہ کا چھوڑا ہوا ادھورا کام ہمارے سر قرض رہ گیا ہے -

ملیریا

مؤلف: مولانا ڈاکٹر عبد الحئی (ہومیو پیتھ) ناشر: ہومیو پیتھک ٹرسٹ - ۴۰ علامہ اقبال روڈ لاہور - صفحات: ۲۳۲ - سائز $\frac{23\times36}{16}$ - جلد پیپر بیک سفید کاغذ معیاری کتابت قیمت: ۲۰/- روپے (محصول ڈاک دو روپیہ بیس پیسے)۔

کتاب کے مؤلف ملک کے نامور بزرگ مولینا عبد الحئی ہیں، جو روحانی و جسمانی ہر دو امراض کے معالج جانے جاتے ہیں۔

اپنے موضوع پر کتاب ایک مکمل اور جامع دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ موصوف نے ملیریا کے عنوان پر ہر اعتبار سے سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ مثلاً ملیریا کے باب میں مختلف نظریات، مختلف علاقوں میں اس کے اسباب و علاج، اس کی روک تھام کی مؤثر عملی تدابیر۔ کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس بیماری کے علاج بالمثل (ہومیو پیتھک طریقۂ علاج) میں تینتیس ۳۳ ادویہ ہیں، یعنی ہر علامت اور ہر سبب کے لیے جدا دوا ہے۔ اس دوا کا انتخاب ہی اصل کام ہے۔ ڈاکٹر عبد الحئی صاحب نے دوا کے انتخاب کا مسئلہ اس قدر آسان کر دیا ہے کہ اس کتاب کی مدد سے ایک عامی بھی بہت حد تک یہ کام کر سکے گا۔ اس لیے یہ کتاب معالجین کے لیے اس موضوع کی دائرۃ المعارف ہے۔ یہ ہر قسم کے افراد کے لیے بہترین رہنما ہے۔

اس کتاب کی آمدنی ہومیو پیتھک ٹرسٹ رفاہی ادارے کے فنڈ میں جمع ہو کر ایک صدقہ جاریہ میں شامل ہو جائے گی۔

(بقیہ کمال سنانیری شہید) کیونکہ اُن کی رفیقِ حیات بھی اُس گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں جس نے دَورِ حاضر میں اسلام کے چراغ کو لہو سے روشن کیا ہے۔ اور دَورِ اوّل کے اُس عظیم خاندان کی یاد تازہ کی ہے، جسے سیرت کی کتابوں میں آلِ یاسر کے عنوان سے ذکر کیا جاتا ہے۔ میرا اشارہ مصر کے خاندان قطب کی طرف ہے۔ اس خاندان کے ایک چشم و چراغ سرخیل مجاہدین، مفسرِ کتابِ الٰہی اور مہندسِ انقلابِ اسلامی سیّد قطب ہیں، جو تبسّم ریز لبوں کے ساتھ تختۂ دار کو چوم گئے۔ دوسرے نامور مصنّف و مفکر جناب محمد قطب ہیں جو سات سال تک مصر کی مختلف جیلوں میں تعذیب کی چکّی میں پستے رہے۔ تیسری باہمت و پُرعزیمت مجاہد خاتون حمیدہ قطب ہیں، جنہوں نے اپنے گوشۂ جگر رفعت کو خدا کے راستے میں پیش کیا۔ چوتھی ایک اور مجاہدہ و صالحہ، شب زندہ دار اور پیکرِ علم و فضل خاتون امینہ قطب ہیں، جو اپنے بھائیوں کے ساتھ کئی سال تک پسِ دیوارِ زنداں رہیں۔ اِس مؤخر الذکر خاتون کی کمال سنانیری کے ساتھ شادی ہوئی۔ اور کمال کو با کمال بنانے میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔ جس تقشّف و زہد اور فقیرانہ زندگی کو کمال شہید نے پسند کیا وہی امینہ قطب نے پسند کیا۔ امینہ قطب کے خیالات و جذبات کا اندازہ اُن کی کتاب " فی تیّار الحیاۃ " (زندگی کی رَو میں) کے مطالعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

جیل کی زندگی کمال اور اُن کے ساتھی اخوان نے جس طرح گزاری ہے۔ وہ اب تمام دُنیا کو معلوم ہو گیا۔ قاہرہ کی جیلوں میں یہ لوگ رہے تو اُن پر تازیانوں کی بارش ہوتی رہی۔ پھر انہیں قاہرہ سے بہت دُور صحرا کے اندر واقع نخلستان میں لے جایا گیا تاکہ انسانیت اور انسانی تہذیب سے انہیں کلیتۃً محروم کر دیا جائے۔ ایک طویل عرصۂ قید انہوں نے پہاڑوں کے دامن میں گزارا جہاں اُن سے پتھر توڑنے کا کام لیا جاتا ہے۔ استاد مصطفٰے مشہور (موجودہ نائب مرشدِ عام) کا بیان ہے کہ خارا تراشی کی مشقت بڑی جان لیوا ہوتی تھی۔ کمال اور سب دوسرے اخوانی بڑی بڑی چٹانوں کو توڑتے اور پھر اُن کو مال بردار گاڑی کے اندر لادتے۔ یہ اتنا کٹھن اور زہرہ گداز کام ہوتا تھا کہ عام حالات میں یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انسان اس طرح کا کام سرانجام دے سکتا ہے۔

بقول مصطفٰے مشہور" کمال سنانیری اِس قدر مضبوط حوصلہ اور اس قدر ایمانی قوت سے لبریز تھے کہ سنگ تراشی اور خارا شکنی جیسی سنگین مشقت کے باوجود زمانۂ قید میں صومِ داؤدی کی پابندی کرتے

رہے۔ ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن بغیر روزہ کے رہنا "۔ کمال صاحب کو صوم داؤدی کی اس قدر عادت ہو چکی تھی کہ رہائی کے بعد بھی شہادت پانے تک وہ صوم داؤدی پر قائم رہے اور وہ بھی اس طریقے سے کہ ان کی سحری کا پتہ چلتا اور نہ افطاری کا۔ پاکستان میں بھی موصوف جب آئے خواہ منصورہ میں رہے یا احیاء العلوم پشاور کے مہمان خانے میں حالتِ سفر کے باوجود صومِ داؤدی کو ترک نہیں کیا۔ یہ عادت بلکہ عزیمت مجھے صرف اُن کے اندر ہی نظر آئی۔ ایک مرتبہ راقم نے اُن سے کہا کہ شدید گرمی کا زمانہ ہے آپ نفلی روزہ ترک کر سکتے ہیں۔ کہنے لگے: " جب اسیری کے زمانے میں تپتے صحراؤں کے اندر اور پتھر کوٹنے کی حالت میں روزہ رکھا جا سکتا ہے تو اُس کے مقابلے اس گرمی کی کیا حقیقت ہے۔ جیل سے میں نے جو اچھی عادت سیکھی ہے اُسے ترک کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

مصطفیٰ مشہور نے جیل کے واقعات سناتے ہوئے بتایا کہ کمال جیل میں بھی انتہا درجے کے ورع و تقویٰ کا مظاہرہ کرتے رہے۔ جیل میں کھانے پینے کی سخت دقت رہتی تھی۔ خوراک اس قدر کم ملتی تھی کہ سدِ رمق بھی نہ ہوتا۔ جیل میں سیاہ شہد کے ڈبے متعدد ساتھیوں کو ملتے۔ ہم نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ جیل کے مطبخ سے ذاتی تعلقات کی بنا پر ہم تھوڑا سا مٹی کا تیل لے لیتے۔ اور ٹین کے ایک ڈبے میں اُسے جلا کر شہد میں پانی کی کافی مقدار ملا کر اُسے گرم کر لیتے اور پھر اُس کے ساتھ روٹی کھاتے۔ یہ سب کام ہم بہت ہی خفیہ طریقے سے کرتے۔ کمال سنانیری کے تقویٰ و احتیاط کا یہ عالم تھا کہ وہ یہ گرم شہد لینے سے انکار کر دیتے۔ اور اس کی وجہ یہ بتاتے کہ یہ جیل کے مطبخ کے تیل سے گرم کیا گیا ہے اور یہ تیل بلا اجازت حاصل کیا گیا ہے۔ مصطفیٰ مشہور صاحب بتانے لگے کہ ہم کمال سے کہتے کہ جیل والوں نے ہماری تمام املاک پر قبضہ کر لیا ہے تو کیا ہم اس کے جواب میں جیل کے مطبخ سے تیل کے چند قطرے بھی نہیں لے سکتے۔ کمال اس دلیل کو تسلیم نہ کرتے۔ لباس کے بارے میں بھی مصطفیٰ مشہور بتاتے ہیں کہ ہم لوگ اپنا اندرونی لباس گھروں سے منگوا کر چپکے سے پہن لیتے۔ اوپر جیل کا موٹا جھوٹا لباس ہوتا تھا جس سے یہ پتہ نہ چل سکتا تھا کہ ہم نے نیچے کیا پہن رکھا ہے۔ کمال سنانیری یہ کام نہ کرتے۔ وہ کہتے، میرے لیے جیل والوں کا دیا ہوا لباس ہی کافی ہے۔ دراصل کمال میں اِس قدر شانِ بے نیازی اور قناعت تھی کہ وہ سب تکالیف برداشت کر لیتے مگر کسی جائز یا ناجائز طریقے سے کوئی چیز حاصل کرنا گوارا نہ کرتے۔

کمال جب منصورہ میں ہوتے تو ادا قم انہیں وقتاً فوقتاً چائے یا کوکا کولا پیش کرتا تو اُسے قبول کرنے سے معذرت کر دیتے۔ وہ کبھی چائے نہ پیتے اور نہ کوکا کولا وغیرہ۔ میں نے ایک بار اُن سے کہا کہ آپ ہر مرتبہ میری پیشکش ٹھکرا دیتے ہیں۔ کہنے لگے: "محسوس نہ فرمائیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ایک مرتبہ مُرشدِ عام (امام حسن البنا رحمۃ اللہ علیہ) نے ہم کارکنوں کو جمع کر کے یہ تلقین فرمائی تھی کہ "اخوان کے لوگوں کو اپنے اوقات اور اپنی ضروریات وغیرہ کو منضبط کر لینا چاہیے۔ ان کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں اور وقت کم ہے۔ چائے اور قہوہ اور اس طرح کی دیگر اضافی اشیاء سے جس حد تک بچ سکتے ہیں، بچیں۔ وقت بھی بچے گا اور مال بھی۔" چنانچہ اس روز میں نے عہد کر لیا تھا کہ میں چائے اور قہوہ وغیرہ نہیں پیوں گا۔ ۱۹۴۵ء سے لے کر اب تک (یعنی ۱۹۸۰ء تک) میں اس عہد پر قائم ہوں۔"

لاہور میں ایک بار اُن کی عینک کا فریم ٹوٹ گیا۔ فیض الرحمٰن ہمدانی صاحب نے بہت کوشش کی کہ انہیں نیا فریم لگوا دیا جائے مگر وہ اس پر ہرگز راضی نہ ہوئے اور اُسی فریم کو مرمت کروا کر پہن لیا۔ ایک مرتبہ پشاور گئے تو وہاں کے دوستوں نے اُن کی رہائش کا انتظام ایک اچھے ہوٹل میں کر دیا۔ اس پر وہ کبیدہ خاطر ہو گئے۔ چنانچہ دوست انہیں سابق احیاء العلوم کے مہمان خانہ میں لے آئے۔ اُس انسان کی زبان پر کبھی کسی چیز کا مطالبہ نہ آتا تھا۔ ہر حالت اور ہر کیفیت میں وہ مطمئن اور خوش رہتے تھے۔ اپنے کپڑے خود دھو لیتے۔ کھانے کے بعد برتن خود صاف کر کے واپس کرتے۔ وہ بڑے خوش مزاج اور نکتہ سنج تھے۔ وہ اپنے دلچسپ مصری لہجے میں نکتہ آرائی کرتے تو محفل زعفران زار بن جاتی۔

وہ اس امر کے لیے بڑے کوشاں رہے کہ افغانستان کے مجاہدین کے اندر اتحاد پیدا ہو جائے۔ مجاہدین کے ساتھ انہوں نے بڑی بڑی طویل گفتگوئیں کیں۔ ۱۹۸۱ء میں اپنے آخری دورۂ پاکستان کے بعد جب واپس جانے لگے تو فرمایا کہ "انشاء اللہ عنقریب واپس آؤں گا اور اتحاد کے لیے جو کوششیں شروع ہو چکی ہیں انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔" مگر اب کمال سُرخرو ہو کر اپنے رب کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی شہادت قبول فرمائے، اُن کے درجات بلند کرے اور اخوان المسلمون کی تحریکِ غلبۂ اسلام کو کامیاب و کامران فرمائے۔ آمین۔
